سمجھو تو حقیقت ہیں نہ سمجھو تو فسانے

عبدالحق اکیڈیمی

اشاعت منزل، کوچۂ عبدالحق (حیدرآباد دکن)

تعداد طبع

اکتوبر ۱۹۴۶ء

Checked 1978

مطبوعہ

عہد آفرین برقی پریس حیدرآباد دکن

قیمت

فہرست مضامین

عرض ناشر

جدید اُردو ادب ایک کشمکش کے دور سے گزر رہا ہے
زمانہ کے تغیرات کا اثر ادب پر بھی پڑنا لازمی ہے اور
انھیں تغیرات کا نتیجہ یہ کشمکش ہے اور کشمکش ہے قدیم
وجدید ادب میں۔ قدیم مکتبِ خیال کے ادیب روحانی
لطافتوں کے قائل ہیں اور جدید ادیب اس بات پر
زور دیتے ہیں کہ زندگی کو اس کے اصلی رنگ میں پیش
کیا جائے۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا جس سیاسی انقلاب،
پریشانی، بے روزگاری وغیرہ سے گزر رہی ہے۔ اس دور
میں محض دماغی عیاشیوں کے سامان فراہم کرنا ایک بے
وقت کی بانسری بجانا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ حقائق
سے آگاہ کرکے دنیا کو بیدار کیا جائے اور یہ اسی طرح ممکن
ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے، اُسے ادب و شعر کے
ذریعہ لوگوں تک پہنچایا جائے۔ ایسی ہی کوششوں کا
نام اُنھوں نے ترقی پسند ادب رکھا ہے اور یہ ایک حد
تک معقول بھی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ ترقی پسند ادب
بھی بڑی حد تک افراط و تفریط کا شکار ہے۔ اس لیے اس
کو ابھی وہ مقام حاصل نہ ہو سکا، جس کا وہ دعوی کرتا

ہاتھوں ہوتا ہے، اس لیے افسانہ نگاری سے لازماً "نفسِ افسانہ" میں ملک بہ ملک
قوم بہ قوم، اور عصر بہ عصر، ترقی اور تبدیلی ہوتی رہی، اور ہر ملک کے رہنے والوں
نے اپنے مزاج ملی اپنے شعور قومی اور اپنے مفاد ملکی کے لحاظ سے اس کو ملک الافلاک
کی بلندیوں تک پہونچایا، فرق صرف اس قدر تھا کہ اس پہاڑ کی بہت سی چوٹیاں تھیں
اور ہر ایک کی سلک مساعی کا سرا مختلف چوٹیوں سے ہم آغوش تھا۔

اس کے بعد وہ نوبت آئی، جہاں ان غیر شعوری، شعور والوں کے افکار کی،
بنیاد پر اس فن شریف کے قواعد وضوابط، اصطلاح واصول کی تعمیر کی گئی، اور یہاں
سے مستعار اور منضبط افسانہ نگاری کی ابتدا ہوتی ہے،

غالباً ہندوستان کے مخصوص سیاسی، معاشرتی، اور عمرانی جزر ومد کے سبب
اُردو میں اس صنف ادب کی کیفیت بدرجۂ اقل "استعجاب آفریں" ہے، منشی پریم چند
کے بعد اور ان کے سوا اس قسم کا تقریباً تمام ادب بعض ایسی خصوصیتوں کا
حامل ہے، جن کو متذکرہ بالا قدروں سے منطبق کرنا آسان نہیں، تغیر اور تبدیلی خواہ
کیسی ہی تیز قدموں سے آئیں، انقلاب کا دہارا کتنی ہی سرعت سے بہے، مگر کسی
ملک، کسی قوم، اور کسی خطے کے ادب میں سے وہ عنصر مفقود نہیں ہوتا، جس کو زمانے کی
ہر نسبت پر قدیم وجدید کی درمیانی انتقالی کڑی یا عبوری نقطۂ اتصال سے تعبیر کیا
جاتا ہے، ہندوستان میں اردو ادب شاید اس کلیے کا واحد استثنا ہے، اور پریم چند
سے ان کے جانشینوں کو نہ صرف کوئی نسبت نہیں بلکہ ایک نقطہ نظر سے آنجہانی کو
منشی کرشن چند، اور کپور سے کوئی واسطہ بھی نہیں،

ہندوستان میں اردو ادب کی تقریباً ہر صنف مدتوں تک زندگی اور اس کے مطالبوں کے تقاضے سے بیگانہ اور بے تعلق رہی، اور چند خاص مسائل اور اشخاص کو چھوڑ کر کم و بیش تغیر کے ساتھ وہی حالت اب بھی پائی جاتی ہے۔ زندگی سے ادب کی ہم آہنگی کا مفہوم صرف مروجہ اور حل طلب مسئلوں کو ادب میں داخل یا شامل کر لینا نہیں ہو سکتا، اور تاوقتیکہ ان مسائل کی نسبت کسی متوازن، معتدل اور مخصوص نقطۂ نظر پر مبنی نظام زندگی کے تمام جزئیات پیش نظر ہوں ادب کی ان خطوں اور پہلوؤں پر ارتقایافتہ صورت بھی مصنوعیت اور عاریت کے معائب سے مبرا نہیں ہوتی، اس عیب اور قبح کے عمرانی اور سیاسی مضمرات خواہ کچھ ہوں لیکن یہ ماننا ہوگا کہ اس طرح وہ ادب جس میں یہ عیب پایا جائے عالمی ادب میں کوئی انفرادی اور امتیازی مقام اپنے لئے نہیں بنا سکتا، وہ زیادہ سے زیادہ دوسرے کسی ادب کی ناستحسن نقالی یا ایک سے زیادہ ادبوں کا غیر معقول اور ناپسندیدہ آمیزہ بن کر رہ جاتا ہے، جس کو نہ دوام ہو سکتا ہے نہ آفاقیت مل سکتی ہے، اور میری دانست میں یہی اور صرف یہی سبب ہے کہ اردو زبان اپنے سے کم مایہ، کم درجہ اور کم رائج دوسری ہندوستانی زبانوں کے ادب سے بھی ٹکر نہیں لے سکتی۔

ہمارے تمام سرمائے کا یہی حال ہے، پرانا ادب تو جیسا کہ میں نے لکھا وقت اور حیات کے ہر تقاضے سے بے خبر تھا، نیا ادب بھی اپنی انفرادیت کا صحیح مقام حاصل کرنے میں کامیاب نہیں،

۱۹۳۱ء یا ۱۹۳۲ء میں افسانہ نویسی کی فنی یا داخلی باریکیوں سے کسی قسم کی واقفیت حاصل کئے بغیر محض شوقیہ لکھا، اور اپنے محدود زاویۂ خیال کے لحاظ سے اس کی تزئین کی، ـــــــــ اس کے بعد تین چار برس کے اندر پانچ چھہ افسانے اور لکھے جو اس کتاب کے "پہلے حصے" میں ملینگے، ۱۹۳۴ء یا ۱۹۳۵ء میں میرے ذہن اور میری فکر نے ادب کی اس ناہمواری کا پہلی بار دھندلا سا احساس کیا، جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اور میرے شعور نے مجھ کو یہ سمجھایا کہ اردو افسانہ نگاری کا ارتقا جب تک خاص مزاج اور مخصوص شعور کے تحت نہ ہو، اس کی ادبیت اور آفاقیت معلوم۔ میں نے دوسرے مقبول اور مشہور افسانہ نویسوں کی کاوشوں میں اس گوہر مقصود کی چھان بین کی اور ناکام و مایوس ہوکر افسانہ نگاری کرنے کو پہلے اور افسانہ پڑھنے کو اس کے بعد ترک کر دیا۔

عہد حاضر کے اردو ادب کو اگر کوئی ایسا شخص پہلی بار پڑھے جو اس ملک کی زندگی کے جملہ مضمرات سے قطعاً بے خبر ہے تو ہندستان کی حیات ملی کی بابت اس کا ذہن جو تصور اور قیاس قائم کرے گا، اس کا اجمالی مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں۔ وہ یقیناً ایک ایسے ملک کا خاکہ اپنے دماغ میں پائیگا، جس کی زندگی کے کسی رخ اور کسی پہلو میں انفرادیت ہمہ سمت نہیں ہوتی، معاشرت میں وہ ہم کو ساری دنیا کے ٹھیکیدار یورپی آقاؤں یعنی انگریز اور انسانیت کو دائمی غلامی کے طوق و زنجیر میں ابدالآباد تک مقید رکھنے والی قوم یعنی ہندو اور روئے زمین کی تمام گندگیوں اور کروہات سے آلودہ ملت، یعنی مسلمان ان سب کا تمرد و تکبر، غیر فطری امتیازات، چھوت چھات، وطنیت

اوہام پرستی، رسمی اتباع، تاویلات تراشی والے معائب کی ایک ایسی "معجون مرکب" پائے گا، جس کی نظیر غالباً کائنات کے کسی گوشے میں نہ مل سکے، اخلاق، سیاست، تمدن، ان میں بھی ہمارا، اس کو عجیب و غریب مخلوق معلوم ہونا معجزے سے کم نہ ہوگا، ——— ہمارے پرانے ادب پر اس کو بے لذت دماغی عیاشی، بے نتیجہ ماتم و مرثیہ خوانی اور بے مادہ نقالی کا شبہ گزرے گا، مگر ہمارے نئے ادب میں اس کو اس سے کہیں زیادہ عیب نظر آئیں گے اور وہ دیانت دار مبصر و نقاد ہے تو نئے ادب کو زندگی کی حقیقتوں اور واقعیتوں کی بدترین تحریف سے تشبیہ دئے بغیر اس کو چارہ نہ ہوگا۔

تحریکوں سے زندگی کبھی تہیدامن نہیں رہی، بُری ہوں یا اچھی، ان سے مفر کسی دور میں بھی ممکن نہ تھا، نہ ہوا کیونکہ روح زندگی کا یہی وہ عنصر ہے جس پر ارتقا کی بنا قائم ہے، ادب بھی زندگی سے ہم آہنگ ہونے کے دوران عمل میں ان تحریکوں سے سرشار ہو جاتا ہے، لیکن یہ امر بدیہی ہے کہ ادب کی یہ سرشاری، صرف تحریک کی روح سے قوت حاصل کرتی ہے، بلکہ بس ظاہری ہر جگہ جدا جدا ہوتا ہے، اور جس طرح ہر ملک کے ادب کی زبان جداگانہ ہوتی ہے، اسی طرح مسائل زندگی کی بیان زبان کا ڈھنگ بھی مختلف ہوتا ہے، اشتمالیت یا اشتراکیت کو ممکن ہے، ابھی روس تک محدود دیکھا جائے، سامراج اور استعماریت کی بہت پرانی تحریکیں ہیں انگلستان اور فرانس، دونوں اسی دیوتا کے مندر میں ہزاروں سال سے پوجا کرتے آئے ہیں، دونوں کا ادب پھر بھی اپنی خارجی تمام خصوصیات اور داخلی مخصوص خصوصیات

میں جدا جدا ہے، فی الحقیقت ادب کے فطری ارتقا کا یہی خاصہ ہے، اور جس ملک میں اس کے خلاف صورت پائی جائے، وہاں کے ادب کا بڑی حد تک نقالی اور تصنع سے مملو ہونا ناگزیر ہے،

کہا جاتا ہے، اور شاید پھر بھی کہا جائے گا کہ ہندوستان کے مخصوص سیاسی اور عمرانی مسائل کی پیچیدگی کی روشنی میں یہاں کے نئے ادب کا یہہ حشر ہونا ناگزیر تھا، مجھ کو اس سے اتفاق نہیں، اس قبیل کی توجیہیں، سبب وعلت تو ہو سکتی ہیں، مگر عذر و معذرت کے طور پر ان کو قبول کرنا ممکن نہیں، اور نہ وہ دلیل جواز بن سکتی ہیں، اوّل اوّل ادب ممکن ہے دست زندگی کا مشاطگی کے لیے محتاج ہو یا رہا ہو لیکن اس کے بعد ہر نوبت پر اور ہر دور میں عروس زندگی کی مشاطگی اس کا حق اور فریضہ ہوتی ہے، اور اگر ہمارا ادب ہندوستان کے بنیادی خصوصی مسائل کے رنگ و رخ کو سامنے نہیں رکھتا، یا اس بارے میں کسی متوازن معقول اور مخصوص رائے کا پیامبر نہیں تو وہ ابھی تک اس سچے اور فطری ادب کی جگہ غصب کیئے ہوئے ہے، جس طرح سورج کا آنا اور اپنی گدی پر بیٹھنا اتنا ہی لازمی اور ناگزیر ہے، جتنا آج کے غروب ہونا ہے۔

لوگ عام طور پر نئے ادب کی گندگی، ناپاکیزگی اور اخلاقی پستی کا رونا روتے ہیں، میں اس کو ادب سے زیادہ ادیب کا قصور اور عیب سمجھتا ہوں، اور گو یہہ صحیح ہے کہ ادیب ادب کا منبع ہے، تاہم ادیب کے معائب سے اتنی ہمت شکنی نہیں ہوتی جتنی ادب کی جبلی کثافت سے ہو سکتی ہے، ہندوستان میں اردو ادب کے اندر یہہ جبلی

کثافت دن بدن ترقی پذیر ہے، اور اس کے استعمال سے پہلے روئے ادب پر معنویت اور نقاقی کا جو نمایاں اور گہرا زخم ہے، اس کا اندمال ممکن نہیں،

افسانہ ہو کہ شعر، مقالے ہوں کہ ناول، ہر صنف کیواسطے' من حیث الصنف' منزل مقصود، اور مطمح نظر ضروری ہیں، اردو ادب کی تہمید امانی اور اس کا ہنوز غیر فطری خطوں پر گامزن رہنا، اس سے عیاں ہے کہ جنگ کی خونخوار ساحرہ تقریباً چند سال سے اپنا آتشین اور مسموم پنجہ عالم انسانیت کے سر پر پھیلائے ہوئے ہے، اور روئے زمین کا کوئی چپہ ایسا نہیں، جو جنگ کے شدائد اور مصائب سے روشناس اور دو چار نہ ہوا ہو، پھر بھی ہندوستان کا اردو ادب اب تک یا تو جمالیت اور اشتراکیت کے بے نتیجہ پرچار میں مصروف ہے یا جنسی گندگی کی کیچڑ اچھالنے میں، جنگ اور اس کی ہولناکیوں کے لائے ہوئے انقلاب ذہنی کا شائبہ ہی ہمارے ادب میں کہیں پر تو سلے، اسی کو وقت کے تقاضوں سے بے نیازی اور غیر فطری سرچشموں سے سیراب ہونا کہا جاتا ہے اور اسی پر سے ادب کے مستقبل کے بارے میں صبر آزما اور ہمت شکن قیاسات حقیقتوں کی حیثیت حاصل اختیار کر لیتے ہیں،

میرے ان پرانے افسانوں میں ممکن ہے، اور عیب ہوں، لیکن نئے ادب کے وباروں سے ان کا دامن تر نہیں،

حصہ دوم کے افسانے ۱۹۴۲ء میں لکھے گئے، ———— اور حصہ سوم کے دونوں افسانے ماہ جنوری ۱۹۴۲ء کی تخلیق ہیں، ———— حصۂ دوم کے افسانوں کی بابت میری اپنی کیا رائے ہے اس کو میں اپنے افسانوں کے دوسرے

مجموعے کی اشاعت تک مخفوظ رکھنے کو قرینِ مصلحت سمجھتا ہوں حصّۂ سوم کے افسانے انگریزی ادب سے مستعار ہیں، اس کا دوسرا افسانہ میری دانست میں اپنی خصوصیتوں کے لحاظ سے دنیا کے بہترین افسانوں میں شمار ہونیکے قابل ہے،

اس لحاظ سے میری "اسٹینڈنگ" افسانہ نویسی کی دنیا میں چار پانچ سال سے زیادہ کی نہیں ہے، اور افسانہ نگاری یا اس کے حسن و قبح پر نقد و نظر کے معاملے میں مجکو "طفل مکتبی" کے درجے سے آگے بڑھنے ہونیکا دعویٰ نہیں،——

اس اعتراف و اظہار کے بعد مجھ کو یقین ہے کہ اس فن کے اندر جو بڑا بڑا ایرانا اور جغادری پڑا ہوا ہے، وہ میری غلطیوں اور خامیوں کو جراتِ رندانہ، نہ سہی جراتِ طفلانہ سمجھکر ضرور نظر انداز کر سکیگا۔

تسنیم مینائی

فروری سنہ ۱۹۴۶ء

پہلا حصہ

۱ ۔ یہہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں (لال چندری)
۲ ۔ جب عشق سکھاتا ہے آداب خود آگاہی
۳ ۔ دنیا بقدر ذوق خرابی خراب ہے
۴ ۔ جو غم ہوا اُسے غم جاناں بنا دیا
۵ ۔ صدائیں دو مرے گزرے ہوئے زمانے کو
۶ ۔ طائرک بلند بام دانۂ دوام سے گذر

ع یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

لال چندری

(۱)

"میں کہتی ہوں کہ آخر میرے لئے ایک لال چندری رنگوا دینے میں تمہارا کیا حرج ہے کون سی اس میں شرع کی خلاف ورزی ہوتی ہے جو تم کو اتنا تامل ہے۔ سات برس میری شادی کو ہوتے ہیں، قسم لو جو تم نے ایک خواہش بھی میری پوری کی ہو، ہر بار یہی جواب ہے کہ "شرع کے خلاف" ہے۔ یہاں میں نہ عالم نہ فاضل معلوم نہیں کیا شرعاً جائز ہے اور کیا ناجائز، مگر اتنا ضرور سمجھتی ہوں کہ "لال چندری" اوڑھنا کسی طرح شرعاً منع نہیں۔ ابا جان کو خدا بخشے کیسے بڑے متشرع عالم تھے، مگر اماں نے میری ہی یاد میں کئی بار لال چندری اوڑھی، اور ابا جان نے کبھی نہیں ٹوکا۔ میں بھی تو آخر سنوں کہ وہ کیا بات ہے جس کی وجہ سے تم میرے لئے ایک لال چندری نہیں رنگوا سکتے۔ روپیہ پیسہ سب اللہ کا دیا گھر میں ضرورت سے زیادہ موجود ہے پھر کیا سبب ہے کہ میری ایک بات بھی نہ مانی جائے۔ ابھی کل بھابی جان آئی تھیں ان کے ساتھ ان کی چھوٹی بہن سلمہ بھی تھی دونوں سرخ چندریاں اوڑھے تھیں، کیسی خوش نما تھیں اور ہونا بھی چاہئے، ساون کا زمانہ

سے جھولے پڑے ہوئے ہیں چندریوں ہی کے دن ہیں۔ میں اگر جھولا نہیں جھول سکتی تو کیا چندری اوڑھنا بھی 'کفر' ہے"۔

صوفیہ اپنے والدین کی اکلوتی لڑکی تھی' اور دوسری اولاد[1] ماں کو مرے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے' باپ البتہ اس وقت مرے جب وہ گیارہ برس کی تھی۔ سلیم اس سے بڑا تھا اور باپ کے مرنے کے بعد سے سارے کاروبار کا مالک "محمد علیم تاجر چرم" کے کارخانے کی یورپ تک ساکھ تھی۔ سلیم بہت ہوشیار تھا اور محنتی' باپ کے بعد بھی کارخانے کو اسی طرح بلکہ اس سے بہتر چلاتا رہا۔ صوفیہ شادی کے قابل ہوئی تو ماں نے نسبت کی تلاش شروع کی اس خوبصورتی اور ہنرمندی کے گھر گھر چرچے تھے' ہزاروں نہیں تو سیکڑوں پیام ضرور آئے ہونگے مگر سلیم کی عقل پر معلوم نہیں کیسے پتھر پڑ گئے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ' مالدار' خوب رو' خوش صفات پیاموں کو چھوڑ کر صوفیہ کا عقد مولوی خیرات علی سے کر دیا' ماں کتنا کتنا چیختی رہی کہ بیٹا صوفیہ کو تم ہی نے انگریزی تعلیم دلائی ہے' خیرات علی کی نسبت سنا ہے کہ وہ بہت کٹر مولوی ہیں' بھلا ان سے اور صوفیہ سے کیسے نباہ ہوگا۔ پھر خیرات علی میں کیا خوبی ہے سوائے روپے کے سو وہ اللہ کا دیا اپنے گھر میں کچھ کم ہے جو اس پر نظر کی جائے دو سہرے اور دو چار نہیں سیکڑوں نستیں ایسی بھی ہیں جہاں دولت خیرات علی سے بھی زیادہ ہے مگر سلیم اللہ کے بندے نے ایک نہ سنی آنکھ بند کر کے عقد کر دیا نتیجہ تو پہلے ہی سے معلوم تھا صوفیہ ہی ایسی تھی جو سات برس تک برداشت کرتی رہی' ماں نے تو شادی کے تیسرے برس ہی انتقال کیا' صوفیہ کی تکلیف

کی اس کی روح پر تکلیف تھی۔ شروع شروع میں تو سلیم یہی سمجھتا رہا کہ یہ سب ڈھکو سلے ہیں، مگر رفتہ رفتہ اسے بھی اندازہ ہو گیا کہ اس نے صوفیہ کو "دنیوی جہنم" میں ڈال دیا ہے، ہاتھ ملتا تھا۔ دیواروں سے ٹکریں مارتا تھا مگر مجبور تھا، صوفیہ سی بہن اور وہ بھی اکیلی، سلیم کو اس سے اور اس کو سلیم سے بہت محبت تھی، اسی تعلق کی بنا پر صوفیہ کی تکلیفیں اس سے دیکھی نہیں جاتی تھیں۔ کئی بار ارادہ کیا کہ صوفیہ کو طلاق دلا دے پھر بدنامی کے ڈر سے خاموش ہو رہا۔ صوفیہ بھی اللہ کی بندی ایسی صابر تھی کہ منھ سے کبھی شکایت کا لفظ نہیں نکلا۔ ساون کا زمانہ تھا، صوفیہ پھر آخر لڑکی تھی بائیس برس کی عمر ہی کیا۔ بھاوج کو دیکھ کر لال چندری کا شوق اسے بھی ہوا، میاں سے فرمائش کی، انھوں نے پہلے ٹال مٹول کی پھر صاف کہہ دیا کہ "میری مرضی نہیں" صوفیہ بھی انسان تھی اور گوشت پوست سے بنی ہوئی، رنج اور صدمے کے سبب سے ضبط نہ ہو سکا۔ اس نے بھی اپنے دل کی بھڑاس نکال ہی لی، سوچا یہ تھا کہ آج تک پلٹ کر میاں کو آپ سے تم نہیں کہا ہے، آج اتنا کہوں گی تو شاید متاثر ہو جائیں۔ اور لال چندری رنگوا دیں، اسے کیا معلوم تھا کہ خیرات علی سے اتنا کہنا بھڑوں کے چھتے کو چھیڑنا ہے، صوفیہ کا اتنا کہنا تھا کہ انھیں "تاؤ" آ گیا:

"صوفیہ تم نے آج، وہ کیا ہے جو کسی شریف زادی کو نہیں کرنا چاہیے شرع کی خلاف ورزی ہونے کے علاوہ شوہر کو الٹ کر جواب دینا اور اس کی مرضی کا پاس لحاظ نہ رکھنا اخلاقی جرم بھی ہے، میں تمھیں دکھا دوں گا کہ اس حرکت کے نتائج کیا ہوتے ہیں" یہ اتنا کہہ کر خیرات علی کمرے سے باہر چلے گئے، اپنے کمرے میں جا کر ایک بکس میں

کچھ کپڑے رکھے کچھ روپیہ رکھا ضروریات کی دو چار چیزیں ساتھ لیں اور گھر کو خدا حافظ کہا۔

(۲)

(مرزا) خیرات علی کے غائب ہو جانے کا صوفیہ کو اتنا صدمہ ہوا کہ صاحب فراش ہو گئی دل اور روح تو اس کے پہلے ہی سے بیمار تھے، اب جسم بھی اثر پذیر ہوا۔ سلیم کو اطلاع ہوئی تو صوفیہ کو گھر لے گیا، حکیم، ڈاکٹر، وید، جھاڑ پھونک والے سبھی کا علاج ہوا، سلیم کی بیوی کو صوفیہ سے اپنی بہن کی طرح محبت تھی اس نے جان توڑ کر تیمار داری کی مگر ؎

مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی

اسے جو چپ لگی تھی وہ کسی طرح نہ ٹوٹی۔ روز بروز کمزور ہوتی جاتی تھی مایوس ہو کر سلیم کا یہ حال ہوا کہ، کارخانے جانا، کاروبار کی طرف توجہ کرنا سب چھوڑ دیا، ہر وقت بہن کی پٹی کے پاس بیٹھا اس کی صورت دیکھا کرتا تھا! صوفیہ کے سامنے تو نہیں الگ چھپ چھپ کر روتا بھی تھا! ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ کانی ہے کسی سے سن لیا کہ کلکتے میں ایک انگریز ڈاکٹر ہے جو دق کا علاج کرتا ہے۔ صوفیہ کو ڈاکٹروں نے دق تجویز کی تھی۔ فوراً صوفیہ کو لے کر کلکتے روانہ ہو گیا۔

(۳)

(خیرات علی غصے اور غیظ کے عالم میں چل تو دئے، مگر ٹرین میں بیٹھ کر خیال آیا کہ صوفیہ سی بیوی جس نے کبھی تم سے تو نہیں کہا چھوٹی جا رہی ہے محبت نے سمجھایا کہ اگلے اسٹیشن پر اتر پڑ اور واپس چلا جا،

اگلا اسٹیشن تھا جنکشن، وہاں اتر کر دوسری واپس لے جانے والی گاڑی کا انتظار کرنے لگے۔ قدرت کے کارخانے میں کسے دخل ہے، خود تو موٹا تازہ آدمی

تھے، ٹرینوں سے واقفیت معلوم، قلی نے انہیں کلکتے والی گاڑی میں بٹھا دیا۔ وہاں
پہونچے تو بے یار و مددگار ٹیکسی، روز تر مارے مارے پھرے، روپیہ زیادہ لائے تھے
ایک ہوٹل میں کسی "کاٹیاں" نے انہیں بھانپ لیا آدمی بیوقوف نہیں تو موروثیت کے
سبب سے دنیا کی اونچ نیچ سے ناواقف ضرور تھے، اس کے پھندے میں آ گئے اور
اس نے انہیں ایک "بالاخانے" پر پہونچا دیا، انہیں یوں دھوکا دیا کہ یہ ایک معزز
ہوٹل ہے اور وہاں "نورجہاں" کو یہ پٹی پڑھائی کہ ہاں اچھا ہے اور موٹا، جانے
نہ پائے، دو چار روز تو دونوں نے انہیں یوں ہی مغالطے میں رکھا پھر رفتہ رفتہ کھل گئے۔
خیرات علی آدمی بہت متشرع اور صوری تھے مگر "بدی سے مقابلے" کی ان میں
صلاحیت ہی نہیں تھی۔ پندرہ روز میں نورجہاں کے عاشق تھے اور عقائد میں تزلزل،
دو مہینے میں تو اس نے یہ حال کر دیا کہ ڈاڑھی مونچھ سب منڈا کر پینے بھی لگے۔ ——
دن بھر نورجہاں ہوتی تھی اور یہ۔ شام کا وقت تھا سورج غروب ہو رہا تھا۔ اس کی
کرنیں لال لال شفق پر سے گزرتی ہوئی خیرات علی پر پڑ رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا میں
بھینی بھینی خوشبو تھی، جس نے خیرات علی کو مست کر دیا۔ سرور کے عالم میں نورجہاں سے
گانے کی فرمائش کی، اور خود لیٹ کر سننے لگے۔

(۴)

سلیم صوفیہ کو کلکتہ لے کر آیا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر رخصت پر انگلستان گیا ہوا
ہے۔ تکان کا اثر اس پر بھی تھا، اور صوفیہ تو بالکل نڈھال ہوئی تھی۔ خیال
کیا کہ تبدیل آب و ہوا سے صوفیہ کو بھی شاید افاقہ ہو، سمندر کے کنارے ایک
بنگلہ کرائے پر لیا۔ اسور اتر پڑا، سنیچر کے دن اترے، اتوار کا

روز تھا کہ صوفیہ کی طبیعت اچانک بہت بگڑ گئی۔ دوپہر سے بگڑی تو شام تک یہ حالت ہوئی کہ ڈاکٹر، حکیم، سلیم سب مایوس ہو گئے، سلیم کو ہچکی لگی تھی، ڈاکٹروں کے جانے کے بعد سے صوفیہ کی پٹی پہ سر رکھے رو رہا تھا صوفیہ کے پلنگ کے پاس شیشے کی کھڑکی تھی، شفق آلود سورج کی کرنیں اس میں سے چھن چھن کر صوفیہ کے سفید لباس اور چہرے پر پڑ رہی تھیں، سرخی اور سفیدی کا اتصال، ایسا معلوم ہوتا تھا، صوفیہ لال چندری اوڑھے ہے صوفیہ نے رنگا و داپسیں سے اس منظر کو دیکھا، قدرت کی ستم ظریفی پر لبوں پر مسکراہٹ آگئی چہرے پر سکون تھا، آخری سانس کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں، اور ہمیشہ کے لئے سو گئی۔ دور سے نورجہاں طوائف کے گانے کی آواز آرہی تھی۔

"چندریا لال رنگ دے، موری رے"

؎ جب عشق سکھاتا ہے آدابِ خود آگاہی

(۱)

حسین گنج ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، مختصر سی آبادی ہے، اور سب کی سب ہندو۔ گاؤں کا محل وقوع بہت اچھا ہے، نشیب میں بستی ہے، اور چاروں طرف اونچی اونچی پہاڑیاں ۔۔ آس پاس کے گاؤں، قصبے، اور شہر، رفتار زمانہ کے ساتھ ترقی کرتے جاتے ہیں لیکن حسین گنج سب سے الگ تھلگ، باقی دنیا کے مخصوص سے بے خبر، ابھی تک اپنے قدیم طرز معاشرت کو نہیں بھولا ہے، لوگوں کی بسر اوقات بالعموم کھیتی باڑی پر ہے لیکن دو چار ایسے بھی ہیں، جن کا ذریعہ معاش صنعت وحرفت ہے، بیس برس گزرے، اس گاؤں کے مالک ایک شریف مسلمان شیخ محمد داؤد تھے، جن کی رواداری اور بے تعصبی کا یہ حال تھا کہ حسین گنج والوں کو جو مراعات اور آسایش ان کے زمانے میں حاصل تھیں، وہ اب ایک ہندو زمیندار کی زمینداری میں ہمدست نہیں ۔۔۔۔ شیخ صاحب گاؤں ہی میں رہتے تھے، مختصر سا خاندان تھا، خود اور ایک تیرہ برس کا لڑکا محمد سلمان۔ وہیں گاؤں میں ایک ڈیرا بنا لیا تھا جو اس مختصر کنبے کے لیے کافی تھا۔

اسی گاؤں میں ایک عورت لچھمی رہتی تھی، جو گاؤں کے سب سے بڑے کاشتکار چودھری رام موہن کی بیوی تھی، دونوں میاں بیوی میں زمین آسمان کا تفاوت تھا، جیسا رام موہن بدمعاش اور آوارہ تھا، ویسی ہی لچھمی نیک اور شریف تھی،

سلمان سے بچپن سے اسے بہت اُنس تھا، اور سلمان بھی اس سے بہت مانوس تھا، اتیس برس ہوئے، شیخ صاحب سلمان کو لے کر حج کو گئے، جس روز واپس آئے، حسین گنج میں عید تھی، سارے گاؤں میں چراغاں تھا، اور گاؤں بھر کے لوگ، بچے، بوڑھے، جوان، عورتیں، سب کے سب اسٹیشن پر جمع تھے، حسین گنج کا اسٹیشن ہی کیا، زمین کے برابر پلیٹ فارم، ایک مختصر سا حجرہ اسٹیشن ماسٹر کے لئے، یہ تھی ساری کائنات اس اسٹیشن کی، ـــ ایک گاڑی صبح کو پورب سے آتی تھی، دوسری رات کو جاتی تھی، گاڑی آئی، شیخ صاحب اترے، اور لوگوں نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا، ہار پھول پہنائے جانے لگے، کچھ لوگ انجن کے سامنے بھی آگئے، ڈرائیور سیٹی پر سیٹی دے رہا تھا، لیکن لوگ جوشِ مسرت سے اس قدر مست تھے کہ کسی نے کچھ نہ سنا، بالآخر عاجز ہوکر اس نے ٹرین آہستہ آہستہ چلانا شروع کی، سیٹی بجاتا رہا، اور تو سب جلدی جلدی ہٹ گئے، لیکن لچھمی جو اپنی چار برس کی لڑکی رانی کو گود میں لئے ہوئے لائن پر کھڑی تھی، نہ ہٹ سکی، انجن کا دھکا لگا، رانی تو گود سے چھوٹ کر لائن کے باہر جا پڑی، اور خود لچھمی پر سے انجن کے دونوں اگلے پہیے گذر گئے، لوگوں نے چیخنا چلانا شروع کر دیا، گاڑی رک گئی، اور لچھمی کو نکالا گیا، جان ابھی تک باقی تھی، شیخ صاحب بھی دوڑ کر وہاں پہونچے، سلمان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، وہ گیا اور رانی کو اٹھا لچھمی کے پاس لایا، ڈاکٹر وغیرہ تو وہاں کوئی تھا نہیں، ایک بید صاحب اسٹیشن پہ موجود تھے، انہوں نے لچھمی کی نبض دیکھی، پھر سر ہلایا، اور شیخ صاحب کی

طرف دیکھ کر ان کے کان میں کچھ کہا، مرتی ہوئی عورت کے زرد ہونٹوں پر خفیف سا
تبسّم نمودار ہوا، اس نے سلمان کو اشارہ کیا کہ اپنا کان میرے منہ کے پاس لاؤ، سلمان
نے جھک کر اپنا کان اس کے منہ کے قریب کر دیا، نہایت نیچی اور کمزور آواز میں لچھمی
نے کہا:۔ ”سلمان میاں، رانی میری اکیلی اولاد ہے، باپ اس کا موجود ہے
لیکن تم جانتے ہو حد درجے کا آوارہ اور بدمعاش، زندگی بھر اس نے مجھے جلایا،
اور کوئی دقیقہ تکلیف دینے کا اٹھا نہیں رکھا۔ میں چاہتی ہوں کہ اب رانی اس کو
دی دی جائیگی، اور وہی اس کا سرپرست اور نگراں ہوگا، نہ تعلیم اس کی ٹھیک ہوگی نہ اخلاق،
اور اس کی زندگی تباہ ہو جائیگی، میں چاہتی ہوں تم مجھ سے عہد کر لو اس بات کا
کہ اس کی نگرانی رکھو گے، اور برابر اس کا خیال کروگے کہ اس کی تعلیم و تربیت اچھی ہو
اور وہ غلط راستوں پر نہ چلے، اور اس وقت تک اس کے نگران رہو گے، جب
تک کسی لائق اور محبت کرنیوالے آدمی کے ہاتھ میں اس کا ہاتھ نہ پہنچ جائے۔
جس سے رانی کو بھی لگاؤ ہو، میں نے عمر بھر تمہاری خدمت کی ہے، اگر اس کے
صلے میں نہیں تو از راہ ہمدردی اور خدا ترسی ہی اس بات کا اقرار کرلو، ایک
مرتی ہوئی عورت کی یہ آخری خواہش ہے، بولو وعدہ کرتے ہو؟“

سلمان کی عمر ہی کیا تھی، اتنی دیر میں اس پر لچھمی کی گفتگو کا یہ اثر ہوا کہ
زار و قطار رونے لگا، بمشکل منہ سے ”ہاں“ کا لفظ کہا، ہاں، سنتے ہی
لچھمی نے اطمینان کی سانس لی، اور ہمیشہ کے لئے آنکھیں بند کر لیں، ایسا معلوم ہوا
کہ اس کی روح صرف سلمان کے جواب کی منتظر تھی، جواب ملتے ہی رخصت ہوگئی۔

(۲)

سلمان کی صورت یقیناً بری تھی، پھیلا ہوا دہانہ، لمبا چہرہ، بڑی ناک، زرد، زرد بال، جو فراخ پیشانی سے اوپر کی طرف الٹے رہتے تھے، آنکھیں بڑی لیکن ان میں کوئی حسن نہیں، چھریرا اگر بھدا سا جسم، اس بدصورت جسم کے اندر دل گرونے کا تھا، اس نے پچھمی سے جو عہد کیا تھا اسے اپنا فرض سمجھا، رانی ماں کے مرنے کے بعد باپ کے سپرد کر دی گئی تھی، دو تین دن کے بعد سلمان اس کے یہاں گیا کچھ دیر اسے کھلایا، دو ایک اچھی باتیں کیں، پھر واپس چلا آیا، اس کے بعد سے اس نے اپنا معمول کر لیا کہ روز جاتا اور دو چار گھنٹے رانی کے ساتھ ہی گزارتا یونہی چار برس گذر گئے، جب رانی آٹھ برس کی ہوئی تو سلمان نے اس کے باپ کو مجبور کیا کہ وہ اس کو کسی زنانہ اسکول میں داخل کرا دے، حسین گنج سے دو اسٹیشن بریلی ہے، جہاں زنانہ اسکول ہے۔ باپ کو تو رانی کی کچھ پروا تھی نہیں، اگر اس کا بس چلتا تو رانی کو کھانے پہننے کو بھی نہ ملتا، لیکن سلمان کے اصرار اور شیخ صاحب کے دباؤ نے اس کو مجبور کر دیا، اور طوعاً کرہاً رانی کو اس نے بریلی بھجوا دیا، اس زنانہ اسکول میں لڑکیوں کو اپنے اعزہ کے سوا غیر مردوں سے ملنے کی اجازت نہ تھی، پھر بھی سلمان جو خود بھی بریلی کالج میں پڑھتا تھا، روز جا کر نوکروں اور استانیوں سے رانی کے حالات اور خیریت دریافت کر آتا تھا اس عرصے میں اس کے باپ کی مالی حالت خراب ہونے لگی، حتیٰ کہ وہ چار برس میں تمام جائداد فروخت ہو گئی اور حسین گنج بھی

ہاتھ سے نکل گیا، یہ غربت تو شیخ صاحب شائد سہہ جاتے مگر اس کی وجہ سے جو ذلت ہوئی وہ ان سے نہ اٹھ سکی، اور تین چار مہینے بیمار رہ کر وہ مر گئے، اب سلمان بے یار و مددگار رہ گیا، کس مپرسی کی یہ حالت تھی کہ ایک کھپریل اس کی اپنی نہیں تھی، جس میں رات کو پڑ رہتا، مگر اس نے اس کا کچھ اثر نہیں لیا۔ دو چار روپے پاس تھے ٹکٹ لیا اور بریلی چلا آیا، دن بھر نورانی کے اسکول کے سامنے ٹہل کر کاٹا، شام کو پارک میں چلا گیا، اور وہاں ایک بینچ پر بیٹھ گیا تھوڑی دیر کے بعد اسی بینچ پہ ایک خوبصورت سا ہندو لڑکا بھی آ کر بیٹھ گیا، کچھ دیر دونوں خاموش رہے پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں، دو گھنٹے میں دونوں میں ایسی یگانگت اور بے تکلفی ہو گئی، جیسے برسوں کے دوست ہوں، اندھیرا ہوا تو دونوں اٹھ کر ٹہلتے ہوئے پارک سے نکلے دروازے پر راجکمار نے سلمان سے پوچھا "کس طرف جائیے گا" سلمان نے مسکرا کر جواب دیا "کہیں نہیں" راجکمار نے حیرت سے پوچھا "کیا تمہارا گھر نہیں ہے" سلمان نے سب واقعات بیان کر دیئے، نورانی کے معاملے کو البتہ پوشیدہ رکھا، راجکمار نے ہنس کر کہا "واہ دوست ہمارا تمہارا دونوں کا ایک ہی سا حال ہے، میں بھی یونہی خانماں برباد ہوں، ماں باپ مر چکے ہیں لیکن تم سے کچھ بہتر حالت ہے، میں ایک دفتر میں محرر ہوں، اور ایک سرائے میں کرایہ کے کمرے میں رہتا ہوں چلو اس وقت میرے ساتھ چلو صبح کو میں تمھیں اپنے دفتر لے جاؤں گا، شائد تمھیں بھی کوئی جگہ مل جائے" سلمان اس پر راضی ہو گیا۔

—— (۳) ——

سلمان اور راج کمار کو ساتھ رہتے ہوئے پانچ چھ برس گزر گئے، پہلے وہ راجکمار کے دفتر میں نوکر رہا۔ پھر دونوں اچھی تنخواہ پر ایک فرم میں ملازم ہو گئے، اس وقت کو دونوں نے بیکار نہیں کھویا، برابر ہر علم پر اور خاص کر فلسفہ پر بہت سی کتابیں زیرِ مطالعہ رہیں، اور مضامین اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتے رہے، دونوں محنتی اور ذہین تھے، تھوڑے ہی دنوں میں بی۔اے، ایم۔اے، ہو گئے دونوں کا نام ہندوستان میں وقعت سے لیا جانے لگا۔

رانی اب تک اسکول میں تھی اور سلمان روزانہ شام کو جا کر اس کے حالات دریافت کرتا تھا، راجکمار نے کئی بار اس راز کو پوچھا، لیکن سلمان نے نہ بتایا، راجکمار شریف آدمی تھا، اس نے پھر دوست کے راز کو معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی، آدمی فہمیدہ تھا، سمجھ گیا کہ سلمان کی زندگی میں کوئی خاص راز ہے جس کا اثر اس کے مستقبل پر پڑے گا۔

چند مہینوں کے بعد رانی اپنی تعلیم ختم کر کے اسکول سے نکلی اور حسین گنج باپ کے پاس چلی گئی۔ رام موہن عیاشیوں اور فضول خرچیوں میں سب جائداد اور روپیہ تباہ کر چکا تھا، رانی آئی تو گھبرایا نہ آؤ دیکھا نہ تاؤ جلدی سے رانی کی شادی اس کی مرضی کے خلاف ایک سینما کے ڈائرکٹر جگدیش سے کر دی۔ جگدیش کلکتہ کا رہنے والا تھا، روپیہ پیسہ اس کے پاس بہت تھا، لیکن نہ اس کے اخلاق درست تھے نہ طبعاً وہ اچھا آدمی تھا، سلمان کو اس رشتے کی خبر اس وقت ہوئی جب شادی ہو گئی

ایک روز باقی تھا، وہ اور راجکمار دونوں جگدیش کو پہلے سے جانتے تھے، سلمان نے اب راجکمار کو رانی کا سب واقعہ بتایا اور دونوں نے مل کر بہت کوشش کی کہ یہ رشتہ نہ ہو، مگر رام موہن کے سر پر تو جن سوار تھا، اس نے کسی کی نہ سنی، اور رانی کی شادی ہوگئی، سلمان پر اس کا بہت اثر ہوا، اس کو سب سے زیادہ صدمہ اس کا تھا کہ وہ اپنے فرض کو پورا نہ کرسکا، راجکمار نے جز اسمجھایا، کہ اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں، مگر سلمان اتنا متاثر ہوا کہ بیمار ہوگیا، ڈاکٹروں نے تبدیل آب وہوا کی رائے دی، سلمان نینی تال چلاگیا، اتفاق کہئے یا قدرت کی ستم ظریفی، جگدیش اور رانی بھی گرمیاں گزارنے وہیں آئے اور سلمان کو رانی کے جوان ہونے کے بعد اس کو دیکھنے کا پہلا موقع میسر آیا،

رانی کو تو سلمان یاد نہیں تھا، کیوں کہ جب سلمان کو اس نے دیکھا تھا وہ بہت چھوٹی تھی، مگر سلمان رانی کو دیکھ کر حیرت میں رہ گیا، بچپن کی رانی اور شباب کی رانی میں جو ایک مکمل نمونہ حسن نسوانیت تھی بہت بڑا فرق تھا، سلمان کا جذبۂ سرپرستی محبت میں تبدیل ہوگیا، اتفاق سے جگدیش کو اپنے کام کے سلسلہ میں بمبئی جانا پڑا اور رانی پھر سلمان کی نگرانی میں رہی، اس سے سلمان کی آتش شوق اور بھڑکی، لیکن اس نے اس کا لحاظ رکھا کہ رانی کو اس کے اس جذبے کی خبر نہ ہو، دو ہفتے میں جگدیش واپس آیا، اور رانی کو لے کر کلکتے چلا گیا، سلمان کچھ دنوں اور نینی تال رہا، پھر بریلی واپس آگیا، اور وہاں سے کلکتے چلا آیا، راجکمار کو اس کے بغیر بھلا کہاں چین تھا وہ بھی کلکتے آگیا، سلمان نے

کوشش کرکے جگدیش کے سکریٹری کی جگہ حاصل کر لی، اور اُسی کے گھر میں بالائی منزل کے ایک کمرے میں رہنے لگا، راجکمار نے پہلے تو کوشش کی کہ سلمان اسی کے ساتھ رہے، مگر جب سلمان راضی نہ ہوا، تو وہ بھی خاموش ہو گیا، اس کی آمدنی اب بہت اچھی تھی، ہندوستان کے بڑے بڑے انگریزی روزنامے اس کی تحریروں کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے تھے، سلمان کی حالت اس سے بھی بہتر تھی وہ رانی کے گھر میں اس لئے مقیم تھا کہ رانی کی نگرانی اور دلجوئی کر سکے، کیونکہ جگدیش بہت بدکردار شخص تھا، لیکن اس نے کبھی رانی کا سامنا نہیں کیا، ایک آدھ بار اتفاقاً مڈبھیڑ ہو جانے کی اور بات ہے، اس کے معنی یہ نہیں تھے کہ سلمان رانی سے بے خبر تھا، رات رات بھر جاگ کر اور دن دن بھر ٹہل کر وہ رانی کے حالات پر نظر رکھتا تھا، تاکہ موقعہ ہو تو اس کی مدد کر سکے، رانی کو اس کا علم نہیں تھا، اس کا چھوٹے سے چھوٹا فعل بھی سلمان سے پوشیدہ نہ تھا،

جگدیش کو پیرنے کا بہت شوق تھا، ایک روز خوب بارش ہوئی تھی جگدیش نے باوجود سب کے منع کرنے کے اور دنوں سے بھی زیادہ پیرنے کی کوشش کی اور تمام شام بھیگ نیم برہنہ، ہوا میں پھرتا رہا۔ دوسرے روز بخار اور زکام نے آ دبایا، ڈاکٹروں نے نمونیہ تجویز کیا، ہزاروں علاج معالجے کئے گئے، مگر ایک ہفتے میں جگدیش مر گیا، جگدیش کے مرنے پر سلمان نے بھی نوکری چھوڑ دی اور پھر راجکمار کے ساتھ رہنے لگا، دونوں نے مل کر کچھ کتابیں لکھیں، جن سے ان کا بڑا نام ہوا،

(۴)

ایک سال گذر گیا۔ اس عرصہ میں سلمان کئی بار رانی سے خود بھی ملا اور راجکمار کو بھی لیجا کر ملایا، راجکمار اس کی خوبصورتی اور قابلیت سے بہت متاثر ہوا، اور سلمان سے کئی بار تعریف کی لیکن سلمان جب رانی سے ملا اس کو بہت غمگین پایا بڑی کوشش سے اس نے اب تک اپنی محبت کو چھپایا تھا۔ رانی کی یہ حالت دیکھ کر اس سے نہ رہا گیا اور اس نے رانی کو ایک گمنام خط لکھا۔

"میں اس وقت کسی قدر خوش ہوں، میری مسرت کا یہ عالم ہے کہ دنیا کا صحیح سے صحیح اور بڑے سے بڑا پیمانہ میری مسرت کا اندازہ نہیں کرسکتا۔ یہ صرف اس وجہ سے کہ میں تم سے اقرار کر رہا ہوں اپنی محبت کا، اس محبت کا جسے اب تک نہایت کامیابی سے میں نے اپنے معمورۂ دل میں پوشیدہ رکھا، مجھے ندامت اور شرمندگی بھی ہے، اس کی نہیں کہ مجھے تم سے محبت ہے، بلکہ اس کی کہ میں اب بھی اس راز کو کیوں نہ چھپا سکا، کیونکہ جتنا لطف اس محبت میں ہے جس کی خبر محبوب کو نہ ہو آتا اس میں نہیں جو اس پر ظاہر ہو جائے، لیکن اپنی محبت کو اب بھی پوشیدہ رکھنا میرے امکان سے باہر ہے، تم کو یہ کبھی نہ معلوم ہوگا کہ میں کون ہوں۔ یہ خط ایک آوارہ خانماں برباد، بے نام و نشان کا ہے، جس میں اتنی ہمت اور مردانگی نہیں کہ تم سے دوبدو اپنی محبت کا اقرار کرے، میں تم سے کچھ مانگتا نہیں صرف تم کو اس سے مطلع کرنا چاہتا ہوں کہ دنیا میں کم سے کم ایک آدمی ایسا موجود ہے جو تم سے اور تمہاری ہر چیز سے محبت کرتا ہے، جو تم پر جان، مال، عزت، سب قربان کرنے کو تیار ہے، جو تمہارے تبسم کے

ہمراہ تبسم، اور گریہ کے ہمراہ گریہ کرتا ہے، مجھے اس سے زیادہ مسرت اور سکون
کی حاجت نہیں، کیونکہ فی الحال ہی میری مسرت بے پایاں ہے، میں محسوس کرتا ہوں کہ
اس سے زیادہ مسرت میرے لئے نامناسب بلکہ ناقابلِ برداشت اور نامنصفانہ ہوگی
ہر انسان کے مقدر میں ایک مقررہ مقدار مسرت اور غم کی ہوتی ہے، اس سے زیادہ
اسے بہرہ ور کرنا ظلم ہے، کیونکہ اگر دنیا بھر کی مسرت صرف ایک ہی شخص کو دیدی
جائے تو دوسرے اس سے محروم رہینگے۔ میں تم کو حسن، معصومی اور انسانیت
کا اوتار سمجھتا ہوں، اور باوجود اس علم کے کہ پرستش صرف خدا کی کرنا چاہیئے، تمہاری
پرستش کرتا ہوں، لیکن غائبانہ اور وہ صرف اس لئے کہ میں اسی طرح ہمیشہ ہمیشہ
تمہارا چاہنے والا رہوں، کیونکہ ممکن ہے کہ اس بات کا علم ہونے کے بعد تمہاری
طرف سے دانستہ یا نادانستہ کوئی ایسی بات ہو جس سے یہ میرا گلستان عشرت
جو خیالی ہی سہی لیکن گلستان عشرت ہے، اُجڑ جائے بصورت موجودہ اس کا امکان
نہیں، اب تو میں ہوں اور میرا تخیل جہاں تک کسی کی رسائی نہیں میں جو چاہتا
ہوں تمہیں فرض کرتا ہوں اور جو چاہتا ہوں اپنے آپ کو بناتا ہوں، اور اس طرح اپنی
خوشی کے پیمانے کو لبریز رکھتا ہوں چھلکنے نہیں دیتا۔"

اس کے بعد کئی خط سلمان نے رانی کو لکھے، اور اسی دوران میں راجکمار کے ساتھ
کئی بار اس کے پاس گیا بھی، لیکن اسے رانی کے برتاؤ سے اس کا علم نہ ہو سکا کہ وہ خطوں
کے بھیجنے والے سے واقف ہوئی ہے یا نہیں، ایک دن صبح سلمان کے پاس رانی
کا نوکر ایک خط لایا، رانی نے اُسے فوراً بلایا تھا، سلمان اسی وقت چلدیا، رانی

اسی کمرے میں بیٹھی تھی، جس میں سلمان رہا کرتا تھا، امید و بیم سے سلمان کی عجیب حالت تھی، سانس بھی بمشکل لے سکتا تھا، دل و دماغ خوشی سے ماؤف تھے۔ سلمان کے بیٹھتے ہی رانی نے کہا۔ "سلمان، دنیا میں صرف تم ہی میرے دوست ہو مجھے اس کا بخوبی علم ہے کہ تمھیں مجھ سے بیحد محبت ہے، تم مجھے اپنی بہن سے زیادہ تصور کرتے ہو، اور مجھے اس کا افسوس ہے کہ میں نے اب تک کیوں تمہاری اس محبت کی قدر نہیں کی۔" سلمان کی آنکھوں آنسو بھر آئے، رانی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ "میں بھی اب سے تمھیں اپنا سگا بھائی سمجھوں گی، آج مجھے تم سے ایک راز کی بات کہنا ہے اور مشورہ لینا ہے، کچھ روز سے میرے پاس گمنام عشقیہ خطوط آ رہے ہیں، میں چاہتی ہوں کہ تم مجھے اُن کے بھیجنے والے کا نام بتا دو .... تم نہیں بتاؤ گے تو سنو، میں خود بتاتی ہوں،

میں جانتی ہوں کہ وہ خط راجکمار نے لکھے ہیں، لیکن اس میں اتنی جرات نہیں کہ وہ مجھ سے زبانی اپنی محبت کا اظہار کرے۔ تم اس کے دوست ہو، جاؤ اور اُسے تیار کر کے یہاں بھیج دو، تم اس سے کہہ دو کہ رانی اس کی منتظر ہے، اس سے محبت کرتی ہے، اور اس سے شادی کرنے کو تیار ہے۔"

سلمان کی پانوں تلے سے زمین نکل گئی، جو منصوبے اس نے بنائے تھے وہ خاک میں مل گئے، اس کے ہونٹوں تک یہ لفظ آ کر رہ گئے "راجکمار نہیں خود میں نے وہ خط لکھے ہیں۔" یہ خیال بھی اس کے دل میں پیدا ہوا کہ اس وقت رانی سے وہ یہ کہہ دے کہ اس کی ماں نے مرتے وقت اس کی بھلائی برائی

کا اختیار اُسے دیا تھا، لیکن اس خیال کے دماغ میں آتے ہی لچھمی کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے آگئی۔ لڑکھڑاتا ہوا وہ اٹھا اور چلا گیا، راستے میں اس نے کوشش کر کے اپنے جذبات پر قابو پا لیا، ہنستا ہوا گھر میں داخل ہوا، راجکمار کو سب حالات کی اطلاع دی، اور کہا "راجکمار جاؤ۔ رانی کے پاس جاؤ اس سے اپنی محبت کا اظہار و اقرار کرو۔ میں بیمار ہوں اور نینی تال جا رہا ہوں، جب تم دونوں کی شادی ہو جائے تو مجھے دیکھنے تم دونوں نینی تال ضرور آنا" یہہ کہہ کر سلمان چلا گیا۔

(۵)

راجکمار کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا، اُسے واقعی رانی سے عشق تھا، وہ فوراً رانی کے گھر پہونچا، رانی بے چینی سے راجکمار کی منتظر تھی، اس کے پہونچتے ہی اس کے صبر کا پیمانہ بھی لبریز ہو گیا اور دونوں ایک دوسرے سے ہم آغوش تھے۔ بہت دیر تک محبت کی باتیں ہوتی رہیں، دونوں ایک دوسرے میں اس قدر محو تھے کہ ان کو سلمان بالکل فراموش رہا۔ شام کو راجکمار واپس آگیا، دوسرے روز پھر گیا، اسی طرح دو چار روز ملاقاتیں رہیں، ایک دن رانی نے خطوں کا ذکر کیا، اور راجکمار کو بتایا کہ اس کے خلاف خطوں نے اس پر یہہ اثر کیا تھا۔ راجکمار پہلے تو تعجب کی وجہ سے چپ رہا، جب رانی نے بعض بعض حصے سنائے تو راجکمار نے انکار کیا اور رانی نے اصرار۔ آخر کار راجکمار نے رانی سے کہا کہ جاؤ، وہ خط لے آؤ، رانی نے سب خط لا کر راجکمار کو دیدیئے، راجکمار نے انہیں پڑھنا شروع کیا،

جوں جوں پڑھتا جاتا تھا، اس کے چہرہ پہ تکلیف، حیرت اور تعجب کے آثار نمایاں ہوتے جاتے تھے، جب اس نے سب ختم کر لئے تو وہ واقعہ سمجھ گیا، اس کے چہرے پہ سکون تھا، خطوط اس نے بند کئے اور رانی سے کہا "رانی یہ خطوط میں نے نہیں، سلمان نے لکھے ہیں"

"سلمان نے لکھے ہیں" رانی نے بے جان مشین کی طرح دہرایا" لیکن جب میں نے اس سے اس امر کا ذکر کیا تو اس نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ میں نے لکھے ہیں"

"رانی" راجکمار نے کہا۔ "کیا تم اب بھی نہیں سمجھیں، سلمان نے وہ ایثار کیا ہے جو انسان سے ممکن نہیں، وہ تم سے محبت کرتا تھا، مگر جب اس نے دیکھا کہ تم کو مجھ سے محبت ہے تو اس نے اپنی محبت کو دبا دیا اور اپنے تئیں مجھ پر قربان کر کے چلا گیا تاکہ میں تم کو پا سکوں رانی، سلمان کے پہلو میں بڑا عالی ظرف دل ہے، اس نے جو وعدہ تمہاری مرتی ہوئی ماں سے کیا تھا اسے ایسا نبھایا ہے کہ دوسرا نہیں کر سکتا۔" یہ کہہ کر راجکمار نے پورا قصہ رانی سے بیان کر دیا۔ رانی کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔

"راجکمار" رانی نے کہا۔ "ہم کو بھی سلمان کی اس قربانی کے صلے میں اپنی خواہشوں کو قربان کر دینا چاہیے" "راجکمار نے کہا" ہاں" اور دوسرے روز دونوں نینی تال روانہ ہو گئے۔

(۶)

سلمان نینی تال پہونچا تو اسی ہوٹل میں ٹھیرا، جس میں پہلے ٹھیرا تھا۔

ایک روز تو اس نے مار پیٹ کر کسی طرح کاٹ لیا، لیکن دوسرے روز سے اس کی ایسی حالت ہوئی کہ وہ کمرے کے باہر نہ نکل سکا۔ اپنے کمرے کی کھڑکی کھول دی، اور اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا دور برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کو دیکھتا رہا، نہ اسے کھانے کی پروا تھی نہ پانی کی۔ رفتہ رفتہ اس کی طاقت کم ہونے لگی، جب کرسی پر نہ بیٹھ سکا تو اٹھ کر پلنگ پر لیٹ گیا۔ اس کے دل میں عجیب عجیب خیالات آتے تھے، کبھی وہ سوچتا تھا، واقعی رانی کو مجھ سے کس طرح محبت ہوسکتی تھی، میں تو اس قدر بدصورت ہوں اور راجکمار بہت حسین ہے، کبھی وہ راجکمار اور رانی کو برکت کی دعائیں دیتا تھا۔ آخرکار جب موت بہت قریب تھی، اس کے دل کو سکون کامل حاصل ہوگیا، اس نے اپنی گذشتہ زندگی پر نظر ڈالی تو اسے اندازہ ہوا کہ لچھمی نے جو کام مرتے وقت اس کے سپرد کیا تھا۔ اس کو اس نے بہ حسن وخوبی انجام دیا اور اب کوئی چیز دنیا میں ایسی نہیں جس کے لئے اُسے زندہ رہنے کی آرزو ہو۔ ایک روز سویرے سکرات کا عالم طاری ہوگیا۔

آخری ہچکی سے کچھ پہلے سلمان نے آنکھ کھولی تو اُسے رانی اور راجکمار کے چہرے نظر آئے۔ دونوں کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ "تم آگئے!" سلمان نے مسکرا کر کہا۔

"سلمان" راجکمار نے جواب دیا۔ "سلمان ہم دونوں کو سارے واقعات کی خبر ہے اور ہم دونوں اسی لئے آئے ہیں کہ جو کچھ تلافی ہوسکے کریں۔

مجھے بہت ندامت ہے کہ میں نے اس ہستی سے محبت کی جس سے تمہیں محبت تھی اور اسے تم سے چھین لیا۔

"راجکمار" سلمان نے آہستہ سے کہا "شرمندہ ہونے کی تمہیں کوئی وجہ نہیں، شرمندگی تو مجھے ہونا چاہیئے کہ بہت سی دفعہ میں اپنے ارادوں میں کمزور ہو گیا اور تقاضائے بشریت نے اکثر لمحوں میں میرے ارادوں کو متزلزل کر دیا، خدا تم دونوں کو خوش رکھے، لیکن اس کا خیال رکھنا کہ رانی آرام سے رہے" یہ کہہ کر سلمان نے آنکھیں بند کر لیں، رانی دوزانو اس کے پلنگ کی پٹی کے پاس بیٹھ گئی اور رو کر کہا "سلمان۔ مجھے تم سے محبت ہے، میں نہیں چاہتی کہ تم مرو۔"

سلمان کے ہونٹوں پہ ایک ہلکا سا تبسم نمودار ہوا، نہایت دھیمی آواز سے اس نے کہا "رانی ایسا مت کہو، راجکمار سے محبت کرو۔ مجھے اسی سے خوشی ہو گی۔"

راجکمار اور رانی رونے لگے۔ سلمان نے آنکھیں ایک بار کھولیں، پھر بند کر لیں اور جان، جان آفرین کے سپرد کر دی، لیکن مرنے سے ایک لمحہ قبل جب وہ اس طلسم نہاں کے دروازے پہ کھڑا تھا جس میں ہر انسان مرتے وقت داخل ہوتا ہے، اُسے پھمی مسکراتی ہوئی نظر آئی اور یہ الفاظ .... "اور کسی لائق اور محبت کرنے والے آدمی کے ہاتھ میں رانی کا ہاتھ دے دینا۔ تم نے اپنا فرض پورا کر دیا، آؤ میرے پاس آ جاؤ" سنائی دیئے۔ ... خوش

؎ دنیا بقدر ذوق خرابی خراب ہے

(۱)

مس رضیہ فیضی اور نواب سعید الدین خاں میں پہلی ملاقات لندن کے ریگل (Regal) تھیٹر میں ہوئی، مس رضیہ اپنے چچا، چچی، اور لیڈی ہمایوں کی معیت میں یورپ کی سیر کر رہی تھیں، پیرس پہنچکر دفعتاً لیڈی فیضی کی طبیعت خراب ہو گئی، اور سر فیضی انھیں لے کر ہندوستان واپس ہوئے، جانا تو مس رضیہ کو بھی انھیں کے ہمراہ چاہیے تھا، لیکن انھوں نے ابھی تک لندن نہیں دیکھا تھا، اس لئے سر فیضی اور دو ہفتوں کے لئے انھیں لیڈی ہمایوں کی سپردگی میں چھوڑ گئے، جس روز یہ دونوں لندن پہنچیں، ریگل میں برنارڈ شا کا ایک مشہور ڈرامہ ہو رہا تھا، لیڈی ہمایوں نے بھی اپنے اور مس رضیہ کے لئے باکس ریزرو کرا لیا،

نواب صاحب سے لیڈی ہمایوں پہلے ہی سے اچھی طرح واقف تھیں، کیونکہ سر ہمایوں اور نواب حمید الدین مرحوم میں گہرا دوستانہ تھا،

”اس کی خوبصورتی اور مردانہ حسن میں تو کوئی کلام نہیں“ مس رضیہ نے نواب صاحب کے باکس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، ”اور وہ تم سے متعارف ہونے کا خواہشمند بھی معلوم ہوتا ہے“ لیڈی ہمایوں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”دیا آلہ! کیا ہے؟ سرخی تجھے بتائیے“ مس رضیہ نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا

"نواب حمید الدین خاں آف اسلم پور کا اکلوتا لڑکا، ماں اس کی افغانستان کی اعلیٰ نسب شہزادی، آکسفرڈ کا گریجویٹ، ٹینس اور کرکٹ کا بلیو، پیرنے کا ماہر، حسین، ذہین، مالدار، جوان، تعلیم یافتہ، اخلاق و آداب مجسم، دنیا کے خوبصورت ترین مجموعہ جواہر کا مالک، ان سب پر طرہ بہادر، دلیر، سخت سے سخت مشکل میں نہ گھبرانے والا، بڑے سے بڑے خطرات میں ہوش قائم رکھنے والا، ابھی سال شکار میں شیر اسکو چھاپ کر بیٹھ گیا، لیکن اسے ذرا ہراساں نہ ہوا، رائفل خالی تھی، جیب سے گولی نکالی، رائفل کو بھرا، اور نہایت اطمینان سے شیر کے منہ میں اس کی نال رکھ کر اس کا بھیجا اڑا دیا۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صفات مجسم ہے، اس میں کوئی عیب نہیں کسی قسم کی کمزوری نہیں" "اگر کوئی عیب ہے تو یہ کہ وہ بے عیب ہے، ایک چیز البتہ ایسی ہے جسے اکثر اصحاب عیب سمجھتے ہیں۔ گو میں خود تو اسے بھی خوبی قرار دیتی ہوں، جانوروں کا اسے بیحد شوق ہے، اس کے اصطبل میں ایک سے ایک اچھا گھوڑا موجود ہے، اس کے پرائیوٹ "زو" میں بھیڑ اور گینڈے بھی ہیں، اس کے چڑیا خانے میں "برڈ آف پیراڈائیز" بھی ہے، کیا یہ بات کسی صورت سے بھی عیب سمجھی جا سکتی ہے، میں تو سمجھتی ہوں کہ یہ بھی ایک صفت ہے، بھلا آج کل کون جانوروں سے اس قدر شغف رکھتا ہے کہ خود ان کی نگرانی کرے، اپنے ہاتھ سے کھلاتا کھلائے، اپنی موٹر میں ہوا خوری کے لئے لے جائے۔"

"مجھے آپ کی رائے سے بالکل اتفاق ہے کیونکہ مجھے بھی جانوروں کا بہت شوق ہے اور میں بھی ان پر بڑی مہربانی کرنے کی حامی ہوں"

"وہ کئی بار نگاہ بچا کر تمہاری طرف دیکھ چکا ہے انھیں کوئی اعتراض تو نہ ہوگا اگر میں تم سے اس کا تعارف کرا دوں"

"مطلق نہیں، بلکہ میں تو خود ان سے متعارف ہونے کی مشتاق ہوں"

ایک دوشیزہ، جس کی رگوں میں نوجوانی اور ہندوستان دونوں کا گرم خون موجزن تھا، جو جانوروں کی دلدادہ تھی، جس کا حسن نظر فریب اور دیدہ زیب تھا، اس کے سامنے اگر لیڈی ہمایوں تعریفوں کے پل نہ بھی باندھتیں تو بھی اس پر نواب سعید الدین خاں کی سی خصوصیات کے مرد کا اثر ہونا لازمی تھا، ایک بار تعارف کے بعد دونوں گویا ایک دوسرے کے ہمزاد تھے، پہلے نواب صاحب اس ہوٹل میں مقیم نہ تھے، جس میں لیڈی ہمایوں اور مس رضیہ ٹھیری ہوئی تھیں، لیکن تعارف ہونے کے دوسرے ہی دن وہ یہاں اٹھ آئے، آخر نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب مس رضیہ ہندوستان واپس آنے لگیں تو دونوں میں خفیہ طور پر معاہدہ ہو چکا تھا کہ جلدی شادی کریں گے، نواب صاحب تو لندن ہی سے سر فیضی کو تار دینے کا ارادہ کر رہے تھے، لیکن مس رضیہ نے کچھ مسکرا کر کچھ سمجھا بجھا کر انھیں اس پر راضی کر لیا کہ دو ہفتے بعد جب وہ ہندوستان واپس آئیں تو کلکتے آکر خود سر احمد فیضی سے مس رضیہ کے خواستگار ہوں۔

(۲)

جس روز نواب صاحب کے آنے کا دن تھا، سر اور لیڈی فیضی کا عجب حال تھا، دونوں میں سے کسی کو بھی اس کا علم نہیں تھا کہ مس رضیہ اور نواب صاحب کے تعلقات کس حد تک پہونچ چکے ہیں، لیڈی ہمایوں نے ضرور انھیں بہت تفصیلی حالات سے مطلع کیا تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ خود مس رضیہ نے ان سے ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا، جس کے باعث وہ عجب مخمصے میں تھے، خصوصاً سر فیضی کیونکہ لیڈی فیضی نے تو عورت ہونے کے سبب سے بہت کچھ فرض کر لیا تھا، ان تین ہفتوں میں جو مس رضیہ کی واپسی اور نواب صاحب کی آمد کے درمیان گذرے انھوں نے کئی بار بند بند لفظوں میں سر فیضی پر اس کا اظہار کرنے کی کوشش کی کہ مس رضیہ نے نواب صاحب کو پسند کر کے اپنے لیے بہترین شوہر کا انتخاب کر لیا ہے۔ سر فیضی اس سے قبل نواب صاحب سے کبھی نہیں ملے تھے لیکن شدہ شدہ بہت کچھ ان کے متعلق سن چکے تھے اور وہ سب کا سب ان کی موافقت ہی میں تھا، انھوں نے ہزار اپنے دماغ پر زور دیا کہ کوئی پہلو اعتراض کا نکالیں، لیکن ہار کر نواب صاحب کی آمد والے دن انھوں نے لیڈی صاحبہ سے اقرار کیا کہ "بجز جانوروں کے متعلق اعتدال سے متجاوز شوق کے، میں نے تعریف کے سوا نواب صاحب کی کوئی برائی نہیں سنی"

"لیکن یہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کی بنا پر اس رشتے سے انکار کیا جائے"

لیڈی فیضی نے ذرا جلدی سے کہا،

"ہرگز نہیں، میں تمہارے خیال سے بالکل متفق ہوں، ایسے رشتے کہیں روز روز تھوڑی ہاتھ آتے ہیں"

"علاوہ بریں رضیہ کو خود جانوروں سے خاصی دلچسپی ہے" لیڈی فیضی نے کہا۔

"ہاں یہ بھی صحیح ہے، لیکن ایک بات تو سنو، سنا یہ ہے کہ نواب صاحب کہیں باہر نکلتے ہیں تو ان کے ہمراہ ایک نہ ایک جانور ضرور ہوتا ہے، علیٰ ہذا القیاس آج بھی وہ کسی نہ کسی چوپائے کو اپنے ساتھ لائیں گے۔ اب مشکل یہ ہے کہ اگر اس کو ڈرائنگ روم کے باہر روک دیا گیا تو ممکن ہے کہ نواب کو ملال ہو، اور اگر اس کو ڈرائنگ روم میں آنے دیا گیا تو وہ ڈرائنگ روم کا ناس کر دے گا۔"

"نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا، اول تو غالب گمان یہ ہے کہ اُن کے ہمراہ کتا رہتا ہوگا، اور اگر ایسا نہ بھی ہوا اور کتے کے علاوہ کوئی اور جانور ہوا تو بھی یہ بہت بد نما ہوگا کہ اس کو باہر روک دیا جائے، اور نواب سے کہا جائے کہ وہ تنہا ڈرائنگ روم میں جائیں۔ کمرہ خراب ہو تو بلا سے، یہ بھی تو دیکھنا چاہیے کہ رشتہ کتنا عمدہ ہے اور اس پر .... کتنی .... باتوں .... کا دار مدار .... ہے" لیڈی فیضی نے رُک رُک کر کہا،

"ہاں ہاں، تمہارا یہ کہنا بالکل درست ہے، اور مجھے تم سے قطعاً اتفاق ہے، میرا ابھی یہ مطلب نہ تھا کہ ان کے ہمراہ جو جانور آئیگا اس کے ڈرائنگ روم میں داخل ہونے میں مجھے پس وپیش ہوگا، میں نے تو صرف ایک

بات کہی تھی، وہ اگر کتا نہیں، جنگلی سور، یا لنگور لے آئیں تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔"

"کیا ان کے زو میں لنگور اور سور بھی ہیں؟" لیڈی فیضی نے پوچھا۔

"میں نے سنا تو یہی ہے کہ ان پاس دنیا کے سب جانور ہیں"

"اگر وہ اپنے ہمراہ کوئی لنگور یا بندر وغیرہ لائے تو وہ واقعی کمرے کی تمام چیزیں توڑ ڈالیگا"

"اُنہ کچھ پروا نہیں، وہ اگر چاہیں تو اپنے ہمراہ دریائی گھوڑا لائیں، میں عبداللہ سے کہے دیتا ہوں کہ نواب صاحب کے ساتھ ثعلب ثمالی کا ریچھ یا سیام کا ہاتھی ہو تو اسے بھی ڈرائنگ روم میں آنے دے وہ تمام زو لے کر یہاں آ جائیں تو بھی مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا، مطلق نہیں"

اس گفتگو کے کچھ دیر بعد سر فیضی نے عبداللہ کو بلا کر کہا

"دیکھو عبداللہ آج سہ پہر کو نواب سعید الدین خاں آف اسلم پور مجھ سے ملنے آنے والے ہیں"

"بہت خوب صاحب" عبداللہ نے متانت سے جواب دیا،

"اگر اس وقت ہر چیز قرینے سے نہ رکھی ہوئی تو یاد رکھنا اخبارات میں "بٹلر وانٹیڈ" کا اشتہار ہوگا اور اگر اس مردود قاسم نے آج کہیں چائے پھینکی، تو میں اپنے ہاتھ سے اس کا گلا گھونٹ دوں گا، سمجھے"

"میں ہر چیز کا خود انتظام کروں گا، حضور"

" ہاں اور ایک بات اور مجھے تم سے یہ کہنا ہے کہ نواب صاحب جانوروں کے بڑے شوقین ہیں"

" جی " عبداللہ نے دل ہی دل میں تعجب کرتے ہوئے جواب دیا،

" اور میں نے سنا ہے کہ جب وہ باہر نکلتے ہیں تو ایک نہ ایک جانور کو اپنے ہمراہ لے کر نکلتے ہیں، اس لئے اگر ان کے ہمراہ بنگال کا شیر، یا افریقہ کا گینڈا بھی ہو تو اُسے ڈرائنگ روم میں آنے دینا"

" حضور، میں یہہ کس طرح پہچانوں گا کہ وہ بنگال کا شیر ہے یا افریقہ کا گینڈا، یا کوئی اور جانور"

" ابے، اس کے سینگ دیکھ کر اور کیسے، لیکن شیر یا گینڈا کہنے سے میرا مطلب یہہ ہے کہ دنیا کا کوئی جانور جو ان کے ساتھ ہو، تیجھ، بندر، ہرن، بکری، تیندوا، وہ اندر آئے سمجھ گئے تم، خوب کان کھول کر سن لو"

" جی حضور، اچھی طرح سمجھ گیا" عبداللہ نے جواب دیا، جواب اس کے لیے تیار تھا کہ نواب صاحب اگر مگر مچھ لائیں تو اسے بھی ڈرائنگ روم میں جانے دے " میں اس کے سینگ دیکھ کر پہچان لوں"

اس نے دل ہی دل میں کہا " بعض بعض وقت صاحب کو کوئی نہیں سمجھ سکتا، شہر بھر میں ان سے زیادہ سنکی شاید ہی کوئی نکلے"

(۳)

پونے چار کا وقت تھا، جب نواب صاحب کی موٹر، جسے وہ خود چلا رہے

تھے۔ "ولا فیضی" کے "یورپ" میں آکر ٹھہری۔ کبھی کبھی دنیا میں ایسے اتفاقات پیش آجاتے ہیں جنکی توجیہہ و توضیح نہ منطقی کر سکتا ہے نہ فلسفی۔ نواب صاحب کی موٹر رُکتے وقت بھی اسی قسم کا ایک اتفاق پیش آیا۔ ایک خوبصورت ننھی سی بکری جو مسٹر فیضی کے ہمسائے نے اسی روز خریدی تھی رسّی تڑا کر مسٹر فیضی کے باغ میں آگئی تھی، اور باغ کے خوبصورت پودوں اور پھولوں سے اپنا پیٹ بھر چکنے کے بعد اس فکر میں تھی کہ اپنے "اچنبھے اور استعجاب کی پیاس" کو (جو اُس جانور کی طبیعت کا جزو لاینفک ہوتی ہے) بجھائے گھر کی پلی ہوئی بکری تھی، اور انسانوں سے مانوس، ممکن ہے کہ نواب صاحب کے "شوقِ حیوانات" کا علم بھی اسے کسی طرح ہوگیا ہو۔ بہرحال واقعہ یہہ ہے کہ جوں ہی نواب صاحب موٹر روک کر اُترے وہ دوڑ کر ان کے برابر آگئی اور "میں میں" کرتی ان کے ہمراہ "یورپ" کی سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ ٹھیک اس موقعہ پر میاں عبداللہ نمودار ہوئے اور نواب صاحب مع بکری کے "داخل ڈرائنگ روم" تھے۔ میاں عبداللہ کے قلب پر سے بھی ایک بارِ عظیم ہٹ گیا کہ نواب صاحب کے ہمراہ بجائے کسی خطرناک یا عجیب جانور کے جس کی شناخت کے لئے اس کے سینگ دیکھنا پڑتے محض ایک سیدھی سادھی، آقا سے مانوس، بکری تھی، جو انہیں کے ہمراہ خود ڈرائنگ روم میں چلی گئی

ڈرائنگ روم میں مسٹر فیضی اکیلے تھے جب یہ "عجیب جوڑا" اس طرح داخل ہوا کہ نواب صاحب کا ایک ہاتھ بکری کی گردن پر تھا۔ لیڈی

فیضی نے یہ سوچ کر کہ کچھ دیر مردوں کا تنہا رہنا زیادہ مناسب ہے اپنی اور رضیہ کی نشست اندر کے ہال میں رکھی تھی،

"مجھے آپ سے مل کر ازحد خوشی ہوئی۔" مسٹر فیضی نے تبسّم کرتے ہوئے کہا، "اور چونکہ میری بھتیجی اس وقت یہاں نہیں ہیں اس لئے مجھے اجازت دیجئے کہ اپنا تعارف آپ کراؤں، میرا نام ہے فیضی، مسٹر اختر فیضی۔"

مسٹر فیضی سے ملاقات کرتے ہی نواب صاحب کو اس کا کامل اطمینان ہو گیا کہ ان میں اور مسٹر فیضی میں تعلقات بہت اچھے رہیں گے کیونکہ اپنے مہمان کو خوش کرنے کے لئے مسٹر فیضی نے بکری کو تھپتھپانا شروع کر دیا تھا، اور گو وہ دل میں ضرور نواب صاحب کی پسند پر متعجب تھے، لیکن اپنے حرکات سے انھوں نے اس کا ذرا بھی اظہار نہ ہونے دیا کہ انھیں کسی قسم کا استعجاب ہے، اور معاً نواب صاحب پر مسٹر فیضی کی "جانور پسند" طبیعت کا بہت اثر پڑا، چند منٹ کے بعد بکری نے ڈرائنگ روم کا جائزہ لینا شروع کیا اور میزبان و مہمان میں اس کے لاتعداد اور غیر محدود صفات پر مکالمہ ہونے لگا، بکری نے ایک بیش قیمت گدّے کا کونا چبانے سے ابتدا کی اور گو دل میں مسٹر فیضی بھنے جا رہے تھے مگر اپنے مہمان کو دکھانے لئے وہ مسکرائے،

"بہت اعلیٰ النسل اور شریف النفس بکری ہے۔" نواب صاحب نے فرمایا،

"جی ہاں بہت خوب جانور ہے، اور مجھے تو پھر بکریوں سے عشق ہے۔"

خصوصاً اس بکری سے، کیونکہ یہہ بہت اعلیٰ ذات اور اچھی تربیت یافتہ ہے، بہت اچھی تربیت یافتہ"

اس بہت اچھی تربیت یافتہ بکری نے اب ایک اور گندے کا مزہ نمونۃً چکھا۔ اور نواب صاحب سر فیضی کے بے مثل سکون کی داد دئے بغیر نہ رہ سکے، کیونکہ تیافے سے تو سر فیضی بارود سے بھی زیادہ "بم نما" معلوم ہوتے تھے، انھیں تعجب اس پر تھا کہ رضیہ نے کبھی ان سے اپنے چچا کے اس ذوق کا ذکر نہیں کیا،

"میں نے سنا ہے، آپ کو جانور پالنے کا بہت شوق ہے" سر فیضی نے کہا،

"بہت زیادہ" نواب صاحب نے اپنے میزبان پر اچھا اثر ڈالنے کی غرض سے جواب دیا،

"کیا جانوروں میں آپ کسی قسم کی تخصیص کرتے ہیں، میرا مقصد یہ ہے کہ آپ کو سب حیوانات سے برابر شوق ہے یا کسی خاص جانور کو آپ زیادہ پسند کرتے ہیں" سر فیضی نے دریافت کیا،

اس وقت بکری ایک صوفے پر چڑھی ہوئی کھنے کی ایک خوشنما میز کو بہت "نقادانہ نگاہ" سے دیکھ رہی تھی،

"نہیں، میں جانوروں میں کسی قسم کا امتیاز نہیں کرتا مجھے تمام حیوانات سے برابر شوق ہے" نواب صاحب نے جواب دیا،

"اس قسم کے بھی آپ کے پاس کچھ جانور ہیں؟" مسٹر فیضی نے بکری کی طرف اشارہ کرکے پوچھا،

"جی ہاں کئی ہیں، کچھ پٹھے اور ایک خوبصورت بچہ" نواب صاحب نے سر ہلاتے ہوئے جواب دیا،

"کیا وہ سب بہت شوخ اور شریر ہیں"

"جی نہیں، کبھی کبھی شرارت کر بیٹھتے ہیں ورنہ عموماً بہت سیدھے اور نیک رہتے ہیں لیکن آپ کی طرح میرا بھی یہی اصول ہے کہ جانور جس قدر خوش و خرم اور آزاد رہنا چاہیں، انھیں اس کا موقع دیا جائے" نواب نے جواب دیا۔

اس آزاد جبلت پھرت والی بکری نے ایک جست کی اور لکھنے کے ڈیسک پر جا کھڑی ہوئی،

"اف وہ کس قدر عمدہ جست لگائی ہے" مسٹر فیضی نے زبان سے کہا، گو دل میں ان کے یہ تھا کہ اگر ان کا بس چلے تو اس بکری کی بریانی پکوا ڈالیں"

"جی ہاں، اور کس رعنائی سے" نواب صاحب نے دل میں یہ سوچتے ہوئے جواب دیا کہ مسٹر فیضی یقیناً پاگل ہیں، جو اتنے شریر جانور کو ایسے سجے سجائے کمرے میں گھسے دیتے ہیں۔ "مگر مسٹر فیضی ایسا نہ ہو کہ کچھ ٹوٹ پھوٹ جائے"۔

"کچھ ہرج نہیں، بلکہ میں تو خدا سے چاہتا ہوں کہ کچھ ٹوٹے" مسٹر فیضی نے ذرا زور زور سے سانس لیتے ہوئے کہا،

"آپ خدا سے چاہتے ہیں کہ کچھ ٹوٹ جائے؟ کیوں؟ کیا اس کمرے کا فرنیچر اور سامانِ آرائش آپ کو پسند نہیں ہے"؟ نواب صاحب نے بھویں چڑھاتے ہوئے جواب دیا،

"نہیں نہیں، اس وجہ سے نہیں، بلکہ اس بناء پر کہ میں برسوں سے کمرے کو ایک حالت میں دیکھتے دیکھتے اُکتا گیا ہوں"

بکری نے پہلے تو بڑی خوبصورتی سے اپنا توازن کیا پھر ڈیسک سے کود کر سامنے کی میز پر پہونچی، اور اس جست و خیز میں چینی کا ایک نہایت خوشنما گلدان شہید کر دیا۔

"آپ نے ملاحظہ فرمایا مسٹر فیضی، اس نے کتنی سبکی سے جست کی، مگر مجھے خطرہ ہے کہ وہ کہیں میز کی تمام چیزیں نہ توڑ ڈالے" نواب صاحب نے بید ہلاتے ہوئے کہا،

"اونھ، مجھے چیزوں کے ٹوٹنے کی رتی بھر بھی پروا نہیں، جانوروں کو اپنا دل خوش کرتے دیکھ کر مجھے سچی مسرت ہوتی ہے، اور اس مسرت پر ہزاروں روپیہ کا فرنیچر قربان ہے، نواب صاحب، میں ان لوگوں میں نہیں جو حیوانات کو محض ایک بے جان، بے حس شے تصور کرتے ہیں، اس قسم کے آدمیوں سے میں بے حد نفرت کرتا ہوں، اور گو میرے حلقۂ احباب میں بھی ایسے ضرور ہیں جو اس بکری کا گلا گھونٹ کر اس کے کباب لگانے کو ترجیح دیں گے لیکن مجھے ان کی اس افتادِ طبع کی وجہ سے ان سے کچھ زیادہ اُنس نہیں ہے۔

یوں ہی اخلاقاً نگل لیتا ہوں" مسٹر فیضی نے پاؤں ہلاتے ہوئے جواب دیا،

"حقیقت تو یہ ہے مسٹر فیضی، کہ انسان بھی بڑی ہی ظالم مخلوق ہے" ــــ

ــــ "میں نے اتنی خوبصورتی سے جست کرنیوالی بکری کم دیکھی ہے ـ یہ دا
چبا جانے پر آپ کو اعتراض تو نہیں"

"جی نہیں، مطلق نہیں، علاوہ بریں یہ پردہ بہت کہنہ اور بوسیدہ ہے،
بکری چبا رہی ہے تو چبانے دیجئے"

"آپ تو اس معاملہ میں مجھ سے بھی بازی لے گئے" نواب صاحب نے
ایک آنکھ بند کرکے دوسری آنکھ سے بکری کو بہت نقادانہ طور پر دیکھتے ہوئے
جواب دیا "آپ کو شاید اس کا علم نہ ہو مگر میں تو دوستی اور یگانگت کے تعلقات
کے آغاز کے وقت "حیوانات سے محبت" ہی کو معیار قرار دیتا ہوں
.... ہاں تو یہ خاص بکری واقعی بہت عجیب و غریب ہے،
ہے نا مسٹر فیضی، اور اس کے اچنبھے کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہیں"

"معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے، آپ ذرا اسے دیکھتے رہئے، وہ اب کود
کر اس دوسری میز پر جانیوالی ہے"

"کیا اس سامنے والی میز پر، مگر وہ تو بہت چکنی معلوم ہوتی ہے،
اس پر تو شاید اس کے قدم نہ جمیں"

بکری نے جست کی اور میز پر پہونچ گئی، وہاں سے جو پھسلنا شروع ہوئی تو
ٹھیک کنارے سے پر آ کر سنبھلی

"چہ چہ چہ!" اُس نے میز کی صاف شفاف سطح پر بہت سی خراشیں ڈال دیں یہ تو بہت ہی بُرا ہوا" نواب صاحب نے فرمایا،

"بُرا ہوا! بُرا کیوں ہوتا!" مسز فیضی نے اپنی طبیعت پر جبر کر کے کہا۔ "یہ میز میرے سکر دادا کے زمانہ کی ہے، اور اب اتنی پرانی ہو چکی ہے کہ اس کے خراب کر دینے کی ضرورت تھی۔"

"کیا لیڈی فیضی کو بھی بکریوں سے شغف ہے"

مسز فیضی نے دانتوں سے ہونٹ دبا لیئے، اور حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکالیں،

"جی ہاں شوق تو انہیں بھی ہے اور قریب قریب اتنا ہی جتنا مجھ کو ہے مگر وہ چونکہ عورت ہیں اور اس لئے غیر مستقل مزاج، اس بنا پر ممکن ہے کہ وہ کسی بکری کو پسند نہ کریں۔"

"کیا اس کا بھی امکان ہے کہ وہ اس بکری کو پسند نہ کریں" نواب صاحب نے دریافت کیا،

"کیا فرمایا آپ نے؟ اس بکری کو پسند نہ کریں" مسز فیضی نے ذرا زور سے کہا۔ "ایسی شوخ اور طرار بکری کو وہ ناپسند کریں، ایسا خیال کبھی دل میں نہ لائیے گا، وہ تو اگر اس بکری کی اس وقت کی حرکتیں دیکھ لیں تو اپنی بکری سے اسے بدل لیں"

بکری نے فوراً ہی اپنی شوخی و طراری کا مزید ثبوت یوں دیا کہ مسز فیضی کے سکر دادا کی میز سے کود کر مسز فیضی کی سکر دادی کی میز پر پہونچی، اس جست و خیز میں اس نے

ہنے کے ایک تیر سے طشت کو الٹ دیا جو گر کر پاش پاش ہو گیا ' اور ساتھ ہی خود بھی مع میز پوش سمٹ سمٹا کر زمین پر آ رہی ' اس کے بعد اس نے ایک گملے کے خوشنما اور خوش رنگ پھولوں سے شغل شروع کیا '

" مس فیضی کا رجحان طبیعت کس طرف ہے " نواب صاحب نے دل میں یہ خیال کرتے ہوئے پوچھا کہ اگر چچا کی طرح بھتیجی بھی ہوئی تو شادی کے بعد شاید دیوانہ ہی نکل جائے '۔

" اوہ ' رضیہ ' اس کو تو ہم دونوں سے زیادہ جانوروں سے محبت ہے "

مسز فیضی نے مشتعل جواب دیا '

" کیا بکریوں کے متعلق بھی اُن کے جذبات آپ ہی کے جیسے ہیں "۔

" جی نہیں ' جہاں تک بکریوں کا تعلق ہے میرا نمبر پہلا ہے ' لیڈی فیضی اور رضیہ دونوں مل کر بھی بکریوں کے معاملے میں مجھ سے پیش نہیں پا سکتیں ' میرا دعویٰ ہے کہ اس بکری سے مجھے جو انس ہے اس کا نصف بھی ان دونوں میں سے کسی کو نہیں ہو سکتا ' میرے احساسات اس بکری کے متعلق ناقابلِ بیان ہیں ' احاطۂ تقریر سے باہر ہیں ' بالکل باہر "

" آپ کے ان بلند و نیک خیالات کے علم سے میرے دل میں آپ کی وقعت بڑھ گئی " نواب صاحب نے سنجیدگی سے جواب دیا '

(۴)

بکری نے ایک قدِ آدم آئینے کا معائنہ کیا ' اور اس میں اپنا ایک ہم شکل رقیب

دیکھ کر کچھ دیر پیتر سے بدلے، پھر حملہ کر دیا، زور سے ایک ترا اتقا ہوا، چند لمحوں کے استعجاب کے بعد اپنی فتح پر مسرور ہو کر بکری نے اپنی توجہ دوسری طرف منعطف کر دی،

"میرے خیال میں آئینہ ٹوٹ گیا" نواب سعیدالدین خاں نے بہ غور آئینے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا،

"کچھ پروا نہیں، اس کا وقت بھی پورا ہو چکا تھا، علاوہ بریں آئینہ بہت پرانا تھا، میرے پردادا نے ایک اطالوی سوداگر سے خریدا تھا، میں آج ہی ایک نئے کے لئے آرڈر دے دوں گا" سر فیضی نے غصے سے جنگ کرتے ہوے کہا،

نواب صاحب کو بڑا استعجاب ہوا کہ سر فیضی کا سا آدمی اور ایک قیمتی آئینے کے متعلق ان خیالات کا اظہار کرے، لیکن چونکہ انھیں ایسے اشخاص کے وجود کا بھی علم تھا جو جانوروں کے معاملہ میں گویا کہ پاگل ہوتے ہیں، اس لئے انھوں نے خاموشی ہی کو زیادہ مناسب سمجھا، اُدھر سر فیضی کا یہ عالم تھا کہ فرط غیظ اور وفور ضبط سے وہ بولنے پر قادر نہ تھے، ان کے جسم کا تمام خون کھنچ کر چہرے پر مجتمع ہو گیا، اور چونکہ انھیں اس کا اچھی طرح احساس تھا کہ ان کا رنگ چقندر کی طرح سرخ ہو گیا ہے، اس لئے انھوں نے اپنی اور بکری دونوں کی جان بچانے کے لئے یہی مناسب سمجھا کہ کمرے سے تھوڑی دیر کے لئے چلے جائیں۔

انھوں نے اپنا منھ دوسری طرف پھیر لیا تاکہ نواب صاحب ان کے اضطرا
کا اندازہ نہ کرسکیں، لیکن جب وہ نواب صاحب سے اجازت خواہ ہوئے تو ان
کی آواز گلے میں پھنس پھنس کر نکل رہی تھی،

"میں ابھی ایک منٹ میں حاضر ہوتا ہوں، ذرا دیکھ لوں کہ لیڈی فیضی اور
رضیہ اب تک کیا کر رہی ہیں"

"ضرور، ضرور، میں جب تک اس بکری سے اپنا دل بہلاؤں گا"
سرفیضی کمرے سے باہر آئے ہی تھے کہ بکری کو کارنس پر کی کوئی چیز پسند
آگئی —— یا تو سر فیضی کا بڑا فوٹو یا لیڈی فیضی کا خوبصورت آئینہ ——
بہرحال چونکہ وہاں تک معمولی طور سے پہونچنا دشوار تھا، اس لئے بکری نے چالاکی سے
کام لیا، نواب صاحب کو اس کا یقین تھا کہ اس بکری کے لئے کارنس پر جانے
کا یہہ پہلا موقع نہیں ہے، پھر بھی وہ اس کی کوششوں کو بہت غور سے دیکھتے
رہے اور جب بکری ایک صوفے اور میز اور کرسی کی مدد سے کارنس پر پہونچ کر
نواب صاحب کو دیکھنے لگی تو نواب صاحب نے کہا "شاباش، شاباش" اور بکری
نے اس کے جواب میں —— "میں میں" —— کیا،
اسی سے کچھ مشابہ آواز گیلری میں سر فیضی کے حلق سے نکلی، اور بجائے چلنے کے
انھوں نے بے تحاشا بھاگنا شروع کر دیا۔
"کہو، نواب کچھ پسند آگئے" لیڈی فیضی نے ہنس کر پوچھا،
سر فیضی نے اپنے حلق سے عجیب و غریب آوازیں نکالیں

"چچا جان، کیوں کیا ہے"؟ مس فیضی نے ذرا پریشانی سے دریافت کیا،

"وہ نواب، وہ بدمعاش نواب، وہ کمرے کا ستیاناس کئے دے رہا ہے"۔
"چچا۔ للہ ذرا خود کو سنبھال کر بات کیجئے"۔ رضیہ نے تردد سے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا جیسے نواب وہاں کھڑے مسز فیضی کی باتیں سن رہے ہوں۔
"میں سنبھلا سنبھلا یا ہوں، اتنا سنبھلا کہ ایک اور سنبھالا مجھے ختم کردے گا، حرامزادی مردار، کمبخت، بکری کے بھیس میں شیطان ہے"۔
"اختر، اختر، کون حرامزادی ہے، کس کی بکری، یہ تم کیا باتیں کر رہے ہو، آخر مجھے بھی تو کچھ بتاؤ"۔ لیڈی فیضی نے حیرت سے کہا،
"اسی کمبخت سعیدالدین کی بکری، اس کی پالتو بکری جسے وہ اپنے ہمراہ لایا ہے، ــــ وہ مردود برابر کہے جاتا ہے کہ "بڑی اچھی بکری ہے" اس کی دماغی قوتیں بہت بلند ہیں، وہ بڑی رعنائی سے حرکت کرتی ہے" اور قسم ہے خدائے لایزال کی اگر اصلی سنجیدگی کہیں دیکھی جاسکتی ہے تو اس ملعون نواب کے چہرے پر، تمھیں اگر دیکھنا ہے تو جاؤ، اسے اور اس کی ولدالحرام بکری دونوں کو دیکھ لو، وہ بدمعاش برابر بکری کو بشکار رہا ہے، اور بکری کمرے کو تحس نحس کر رہی ہے، میرا تو خیال یہ ہے کہ یہ نواب پاگل ہے، کیوں کہ کمرہ کباڑی کی دوکان بنا ہوا ہے، اور ساتھ ساتھ میرا دماغ بھی ــــ" یہاں مسٹر فیضی نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے تھام لیا ــــ جب وہ کوئی غصہ توڑتی ہے

تو وہ متبسم ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ بڑے سلیقے کی بکری ہے، بہت خوب کودتی ہے" ــــــ اور مجھے اس کی خوشامد میں ہاں میں ہاں ملانی پڑتی ہے، گو دل دل ہی میں اس کو اور خود کو گالیاں دیتا ہوں غضب خدا کا، وہ میرے ہی ڈرائنگ روم روم کا اس اُجاڑ رہی ہے، اور میں ہی اس کی تعریف و توصیف کر رہا ہوں میں ہی کہہ رہا ہوں کہ ہاں یہ بہت اچھی بکری ہے، خوب جست کرتی ہے واقعی بہت سلیقہ شعار ہے، جاؤ جاؤ تم دونوں خود جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لو .... نہیں، ٹھہرو، سنو" ــــــ

اس وقت ایک زوردار جھناٹے کی آواز سنائی دی کیونکہ ڈرائنگ روم میں بکری نے ایک خوبصورت شیشے کی کشتی نیچے گرائی تھی، جو گر کر چور چور ہو گئی۔

"معلوم ہوتا ہے وہ بکری یا اس کا دماغ خراب مالک، بلکہ غالباً دونوں کارنس پر پہنچ گئے ہیں۔ سنو رضیہ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا" سر فیضی نے کہا۔

"اس میں کوئی نہ کوئی پیچ ضرور ہے ایسا تو کبھی نواب سعید الدین خان کے متعلق سنا نہ تھا" لیڈی فیضی نے کہا،

"تم خود جا کر دیکھ لو نا، میں تو ابھی آؤں گا نہیں، پہلے سر پر ٹھنڈا پانی ڈالوں گا، تب آؤں گا" یہ کہہ کر سر فیضی غسل خانے کی طرف بھاگے،

"رضیہ یہ کیا ہوا" لیڈی صاحبہ نے تردد آمیز لہجے میں پوچھا،

"یہ بھی میرا خیال تو یہ ہے کہ اس معاملہ میں کوئی نہ کوئی غلط فہمی ہوئی ہے،

اوّل تو انھیں بکریوں کا شوق ہے نہیں، اور بفرض محال ہے بھی تو مجھے کچھ پرواہ نہیں، میں سب درست کرلوں گی، آئیے چلئے ہم دونوں چلیں۔"

(۵)

مجبوراً لیڈی فیضی نے رضیہ کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں قدم رکھا ــــــ کمرے کی حالت دیکھ کر انھوں نے چیخ نہیں ماری، اس کے لئے بجز اس کے کیا کہا جائے کہ ان میں ضبط کا مادہ بہت تھا یا ان کی نشست و برخواست بہت اعلیٰ طبقوں میں رہی تھی۔

بکری کارنس پر خراماں خراماں ٹہل رہی تھی ہر قدم پر ایک توڑا ٹوٹتا تھا اور ہر تڑاقے پر بکری کی مسرت میں اضافہ ہو جاتا تھا، اور یہ ظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نواب صاحب بکری کی مسرت سے بہت خوش ہیں، ابھی تک انھیں لیڈی کے آجانے کا علم نہیں تھا۔

"شاباش، شاباش" نواب صاحب فرما رہے تھے، اور بکری کہہ رہی تھی "میں میں"

"واللہ کتنی شاندار بکری ہے، مجسّم رعنائی، سراپا شوخی و طنازی" نواب صاحب منہ ہی منہ میں کہتے جاتے تھے، لیڈی فیضی نے بہت کوشش اور جبر سے اپنے چہرے پر سنجیدگی پیدا کی، انھوں نے سوچا کہ نقصان تو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، اس کی تلافی تو ہو نہیں سکتی، لیکن نسبت کی تکمیل کا اب بھی امکان ہے، اسے کیوں کھویا جائے انھیں یہ خوب ــــ معلوم تھا کہ نواب صاحب

کو رضیہ سے عشق ہے، لیکن ان کو اس کی اطلاع بھی مل چکی تھی کہ نواب صاحب آداب مجلس کے بڑے پابند ہیں اور وہ ان لوگوں سے بہت دور دور رہتے ہیں جن کے آداب میں خامی ہوتی ہے، ساتھ ہی انھیں یہ خیال پیدا ہوا کہ کہیں نواب صاحب اس طرح ان کا اور اُن کے شوہر کا امتحان تو نہیں لے رہے ہیں، انھوں نے چپکے سے رضیہ کے کان میں یہہ بات کہی،

اتفاق سے اوسی وقت نواب صاحب پلٹے تو ان کی نظر لیڈی فیضی اور رضیہ پر پڑی۔ انھوں نے کمان کی طرح خم ہو کر دونوں کی تعظیم کی، اور رضیہ لیڈی فیضی دونوں کے چہروں پر مکمل متانت اور سنجیدگی دیکھہ کر ان پر بہت خوشگوار اثر ہوا،

"سر فیضی تو مشغول ہیں، مجھے اپنا تعارف شاید خود کرانا پڑے گا، یا پھر رضیہ میرا تعارف کرائیں، رضیہ سے تو آپ واقف ہیں نا" لیڈی فیضی نے کہا،

"خوب اچھی طرح" نواب صاحب نے مسکرا کر جواب دیا "میں تو ان کی رگ رگ سے واقف ہوں"

تعارف کے بعد قدرتاً موضوع گفتگو بکریوں کی طرف پھرا اور خصوصاً ڈرائنگ روم کی بکری کی طرف۔

"آج یہ بکری بیحد خوش و خرم ہے، کیونکہ اس کو مکمل آزادی حاصل ہے" لیڈی فیضی نے کوچ پر ایسی جگہ بیٹھتے ہوے کہا جہاں سے انھیں بکری اور کارنس دونوں نظر آتے تھے،

"مجھے یہ دیکھ کر بیحد خوشی ہوئی کہ آپ سب لوگ جانوروں سے اس قدر مہربانی کا سلوک کرتے ہیں" نواب صاحب نے فرمایا۔

"میں تو آپ سے پیشتر ہی کہہ چکی ہوں کہ میں انھیں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتی ہوں" رضیہ نے شرارت آمیز مسکراہٹ سے جواب دیا۔

"تو کیا آپ کو بھی بکریوں سے اسی قدر شغف ہے جس قدر آپ کے چچا چچی کو" نواب صاحب نے ذرا سنجیدگی سے پوچھا۔

"بلکہ ان دونوں سے کچھ زیادہ" رضیہ نے پھر مسکراتے ہوئے جواب دیا، نواب صاحب کے خوبصورت چہرہ پر خفیف سے تعجب کے آثار نمایاں ہوئے "ہوں" انھوں نے کہا،

"واقعی اس میں تو شک نہیں کہ بکری بہت خوبصورت اور شوخ و شنگ چیز ہے پھر میرا تو یہ مسلک ہے کہ جو شخص جانوروں پر مہربانی کرے اس کی اسی ایک صفت کی بنا پر اس کے تمام عیوب سے چشم پوشی کرنا چاہیئے۔ ذرا اب اس بکری کو دیکھیے، معلوم ہوتا ہے وہ دل ہی دل میں کارنس سے لیڈی فیضی کی کوچ تک فاصلہ ناپ رہی ہے"

مگر قبل اس کے کہ لیڈی صاحبہ کوچ خالی کر سکیں، بکری نے ایک زقن بھری، اور لیڈی فیضی کے سر پر سے اِل بال نکتی ہوئی سنگ مرمر کے چکنے فرش پر آگری، گرتے ہی وہ کئی قدم تک پھسلی اور پھر سنبھل گئی نواب صاحب پر پھر بکری کی اس تیزی اور طرارے کا بہت اثر پڑا لیکن اس سے زیادہ اثر

ان پر لیڈی فیضی کے سکوت اور سنجیدگی کا ہوا۔ لیڈی صاحبہ کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایک بکری ان کے سر پر سے کود کر نکلی ہو، مگر انھوں نے اپنے چہرے سے کسی بھینپ یا اضطراب کا اظہار نہ ہونے دیا، نواب صاحب نے دل میں سوچا کہ جس چچا نے اپنی بیوی کو ایسی عمدہ تعلیم دی ہے اس کی تعلیم خود کس قدر اعلیٰ ہوگی، اور اس کی بھتیجی کی تعلیم و تربیت کا تو کچھ کہنا ہی نہیں، کیونکہ اس پر چچا اور چچی دونوں کا ملمع چڑھا ہوگا، اس طرح بکری کا ہر فعل نواب کو عشق کی زنجیروں میں زیادہ سختی سے جکڑتا جاتا تھا، اور جیسے جیسے وہ اوس کی حرکتوں سے محظوظ ہوتے تھے ویسے ویسے اُن کے خانۂ دل میں "چراغ محبت" کی لو تیز ہوتی جاتی تھی —

(۶)

بکری نے کارنس کے ہمالیہ سے اب اپنی عنان توجہ پیانو کے قاف کی طرف پھیری، اور شاید اس دھوکے میں کہ پیانو پر جو گیتوں کا گٹھا رکھا ہے، وہ البرز کی چوٹی ہے، نہایت "رعنائی" سے جست کر کے اس پر آگئی؛ پیانو پر کودنے سے جو آواز پیدا ہوئی اس سے وہ اس درجہ متعجب اور محظوظ ہوئی کہ اب اس نے علی التواتر پیانو پر کودنا شروع کر دیا،

"بکری کے پیانو بجانے پر آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں،" نواب صاحب نے لیڈی فیضی سے دریافت کیا،

"مطلق نہیں،" لیڈی فیضی نے ندا زور دار لہجے میں جواب دیا،

"معلوم ہوتا ہے اسے گیتوں سے بہت دلچسپی ہے" نواب صاحب نے بکری کی طرف دیکھ کر کہا، بکری نے گیتوں کے بنڈل کو چبانا شروع کیا، پھر اس نے پیانو پر "مسٹر گشتی" کی مشق کی، جس کے سبب سے اس سے عجیب و غریب آوازیں نکلنے لگیں۔ نواب صاحب نے لیڈیز کی توجہ ان آوازوں کی طرف منعطف کرائی، اور کچھ دیر اُن کی سادگی اور دلکشی پر گفتگو کرنے کے بعد ان کے زور پر موسیقی کے چند اصول وضع کیے، مس رضیہ تو ہر فیشن ایبل چیز پر جان دیتی تھیں، انھوں نے نہایت ذوق و شوق سے اس مباحثے میں حصہ لیا، اور بالآخر نواب صاحب کو تسلیم کرنا پڑا کہ موجودہ موسیقی پرانے زمانے کی راگ راگنیوں سے برتر ہے،

"مجھے یقین ہے کہ سر فیضی بھی بکری کی اس ادا سے بہت محظوظ ہوں گے،" لیڈی فیضی نے گفتگو کا رخ بدلنے کی غرض سے کہا، نواب صاحب نے پوچھا، "یعنی انھیں بھی موسیقی سے دلچسپی ہے؟"

"دلچسپی تو میں نہیں کہہ سکتی، کیونکہ انھیں راگ راگنیاں زیادہ پسند نہیں، البتہ سیدھے سادھے شعر انھیں بہت پسند آتے ہیں ـــــ رضیہ، دیکھو تو تمھارے چچا کیا کر رہے ہیں آخر وہ کسی طرح نل کا پیچھا چھوڑیں گے یا نہیں، چائے کا وقت گزرا جا رہا ہے۔"

"میں ابھی دیکھ کر آتی ہوں" کہہ کر مس رضیہ چلی گئیں،

"کیا نل میں کچھ خرابی ہو گئی ہے" نواب صاحب نے ازراہ استعجاب

پوچھا۔

"نہیں نہیں، بلکہ سر آخر جب کسی چیز سے متاثر ہو جاتے ہیں تو سر پر ٹھنڈا پانی ڈال لیتے ہیں اور اس کے بعد اس کا زیادہ امکان ہوتا ہے کہ نزلہ ہو جائے۔"

"میرے آنے کے بعد سے تو ایسی کوئی بات نہیں ہوئی جو انہیں ضرورت سے زیادہ متاثر کرتی"

"اس بکری کی غیر معمولی توجہ اور طراری نے تایا ان پر بہت اثر ڈالا کیڈی" نیفی نے بات بنائی ' اس موقع پر نواب صاحب نے محسوس کیا کہ اب انہیں اصل معاملے کی طرف رجوع کرنی چاہیئے۔

" لیڈی نیفی، ممکن ہے آپ نے شدہ شدہ سنا ہو کہ میں کچھ ......

......" نواب صاحب نے شروع کیا لیکن لیڈی نیفی نے فوراً ٹوک دیا۔

" نہیں نہیں ، میں نے نہ سنا نہ مجھے کبھی اتنی لغو خبروں کا یقین آ سکتا ہے۔"

" بہرحال لوگ ایسا کہتے ہیں، حالانکہ اصلیت یہ ہے کہ میں بہت سادہ زندگی بسر کرنے والوں میں ہوں، میری خواہش ہے کہ میں اور رضیہ زن و شو ہو جائیں۔

——— (ذرا ایک منٹ توقف فرمائیے) ——— ———

مجھ پر ان کے حسن، ذوق سلیم، شوق موسیقی اور جانوروں پر مہربانی کے خصوصیات نے انگلینڈ ہی میں بہت اثر ڈالا تھا، اب جس وقت سے یہاں آیا ہوں، آپ سب کے طرزِ عمل نے اور بھی مجھے ان کا گرویدہ بنا دیا ہے، کیا میں یہ امید کروں کہ آپ میری تمنا بر آری میں میری مدد فرمائیں گی ' ....

جب لیڈی فیضی اپنی مسرت اور خوشی کا نواب صاحب پر اظہار کر رہی تھیں اس وقت ان کا "موضوع گفتگو" یعنی رضیہ اپنے غضبناک چچا کو سمجھانے میں مصروف تھی۔

"رضیہ، خدا کی قسم، وہ نواب بالکل پگلا ہے" سر فیضی نے اپنے بال نوچتے ہوئے کہا "پگلا، بالکل پگلا، اتنا پگلا کہ دس ہزار پگلوں کا وہ ایک پگلا ہے"

"چچا جان یہ بات نہیں ہے بلکہ اصل میں انھیں جانوروں سے دلچسپی زیادہ ہے، اور چچی کا تو یہ خیال ہے کہ نواب صاحب ہمارا امتحان لے رہے ہیں"

"امتحان" سر فیضی نے چیخ کر کہا، "کس چیز کا"

"اس کا کہ ہم لوگ واقعی جانوروں سے محبت رکھتے ہیں یا نہیں"

"تو تم میری طرف سے اس سے کہدو کہ میں اس سے نفرت کرتا ہوں"

"چچا جان، ذرا تو عقل سے کام لیجئے، نواب صاحب بہت فہمیدہ آدمی ہیں، ذرا یہ تو دیکھئے کہ اس تمام چیقلش میں وہ کس سکون اور سنجیدگی سے بیٹھے ہوئے ہیں"

"ادھر دیکھو رضیہ، میں تمھارا چچا ہوں اور میری یہی خواہش ہے کہ نواب صاحب سے انسانیت کا برتاؤ کروں۔ لیکن اگر تم نے پھر اس قسم کا کوئی اور جملہ زبان سے نکالا تو میں پاگل ہو جاؤنگا، کیا تم چاہتی ہو کہ مجھ پر جنون کے دورے کا حملہ ہو جائے، اور میں مر مرا جاؤں —

——— "اس چیقلش میں سنجیدگی اور سکون، میرے باپ کے اللہ ———

میرا ونیس کا آئینہ، میرے دادا کی میز، میرا چینی کا گلدان، میری الماری

اور وہ مردار بکری ـــــ اگر میں اس نواب کے یہاں ایک بکری، لے کر پہونچ جاؤں
تو بھی کیا وہ اسی سکون اور سنجیدگی کو کام میں لائے گا"

"مگر چچا جان، بکری ہے خوبصورت"

"تو کیا میں اس بکری کو لے کر جاؤں" ـــــ "رضیہ اب تو تم نے ضرور
اس سے شادی کا ارادہ ترک کر دیا ہوگا"

"اب تو اور بھی پختہ ہو گیا ہے"

"رضیہ، خدا کے واسطے عقل کے ناخن لو، میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ اس خبط
سے باز آؤ، جو شخص ایک سجے سجائے کمرے میں اتنی شریر بکری، لے کر داخل ہو سکتا
ہے، اس سے ایک شیرخوار بچے کے پالنے میں ناگ چھوڑ دینا کب بعید ہے" ـــــ
تمھاری چچی کیا کر رہی ہیں"

"آپ کا انتظار، چچا جان خدا کے واسطے اپنے آپ کو سنبھالے رکھیئے گا"
ورنہ سب معاملہ بگڑ جائے گا، اور اب جلدی چلیئے اور نہ انھیں خیال ہوگا"

"خیر اچھا چلو" مسٹر فیضی نے بیکسانہ انداز سے جواب دیا

جس وقت یہ چچا بھتیجی ڈرائنگ روم میں داخل ہوئے لیڈی فیضی نواب
صاحب سے باتوں میں مشغول تھیں، بکری کتابوں کی ایک الماری کا معائنہ کر رہی
تھی، پہلے تو اس نے اس الماری کے کچھ شیشے توڑے، پھر جوں ہی لیڈی فیضی
نواب صاحب کو ایک تصویر دکھانے کے لیئے کھڑی ہوئیں اس نے دوڑ کر لیڈی
فیضی کے کولوں میں ایک ٹکر ماری، جس کے سبب سے وہ گر پڑیں۔

"رضیہ، کیا یہ مالیخولیا کی نشانی نہیں ہے" سر فیضی نے آہستہ سے کہا،
"آپ کے چوٹ تو نہیں آئی" نواب صاحب نے لیڈی فیضی کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے کہا،

"جی نہیں، مطلق نہیں۔ یہ تو بکری نے مذاق کیا تھا"

"جی ہاں محض مذاق، صرف ایک خوش فعلی" سر فیضی نے دانت بھینچ کر کہا،

قبل اس کے کہ نواب صاحب کچھ جواب دے سکیں، بکری نے باغ کی جانب کھڑکی پر دھاوا بول دیا،

شاید یہ بکری اب باغ میں جانا چاہتی ہے اور مناسب بھی یہی معلوم ہوتا ہے" نواب صاحب نے باندازِ استغنا فرمایا،

"مجھے تو اس میں کوئی پس و پیش نہیں، مگر میرا مالی بہت خطرناک آدمی ہے، اگر اس کے ہتھے یہ چڑھ گئی تو اس کی خیر نہیں" سر فیضی نے جواب دیا،

"تو اس سے آپ کا مطلب یہ ہے کہ بکری کمرے ہی میں رہے"

"نہیں نہیں، اگر اُسے یہاں وحشت ہوتی ہے تو میرا ہرگز یہ منشا نہیں ہو سکتا کہ اس کی خوشی کے خلاف اسے یہاں روکا جائے۔ آپ کی رائے میں اگر رضیہ اسے اپنے ساتھ سارے مکان کی سیر کرا لائیں تو کیسا ہے"

"آپ کی خوشی جو چاہے کیجئے ___ کیا آپ عموماً بکریوں کو مکان بھر میں ہر جگہ جانے دیتے ہیں یا ان کی پہونچ صرف اسی کمرے تک ہے"

"میں تو انہیں اس کمرے میں بھی نہیں آنے دیتا ہوں، ہاں اگر کسی مہمان کے ساتھ کبھی کوئی جانور وانور ہو تو بیشک وہ اس کمرے میں اپنے آقا کے ہمراہ آجاتا ہے"

"معزز مہمان کے ہمراہ" لیڈی فیضی نے جلدی سے لقمہ دیا۔

"وہ بھی شاذ شاذ ـــــ کیا آپ بھی بکریوں کو اپنی کوٹھی میں مکمل آزادی دے رکھتے ہیں، کہ جہاں چاہیں آئیں جائیں" رضیہ نے کہا،

"کیا فرمایا آپ نے؟ میں اپنی کوٹھی میں بکریوں کو ہر جگہ جانے دوں، یہ آپ سے کس نے کہہ دیا، ہرگز نہیں، ہاں اوروں کے گھر میں وہ جو چاہیں کریں، اس میں مجھے کوئی دخل نہیں، مگر میں اپنے یہاں انہیں اس قسم کی آزادی دوں، کبھی نہیں"

سر فیضی صوفہ پر سے کود کر کھڑے ہو گئے۔

"چچا جان" رضیہ نے جلدی سے پکار کر کہا،

"میں اب ضبط نہیں کر سکتا" سر فیضی نے اپنے کالر و ٹائی سے لڑتے ہوئے کہا۔ "مجھے بولنے دو"

"کیوں جناب نواب صاحب، کیا آپ کا مطلب یہ ہے کہ آپ بکریوں کو اپنے مکان میں کبھی داخل ہی نہیں ہونے دیتے؟ کیا آپ کے جواب سے میں یہ سمجھوں کہ آپ بکریوں پر اتنا ترس بھی نہیں کھاتے کہ انہیں ایک فرنیچر سے

آراستہ اور خوبصورت سازو سامان سے پیراستہ کمرے میں گھسنے اور وہاں کی اشیا کو توڑنے پھوڑنے دیں، کارنس کو برباد کرنے دیں، آئینوں کو چور چور کرنے دیں، مہمانوں کی ٹکریں مارنے دیں"

"یقیناً نہیں، میں جانوروں کا دلدادہ ضرور ہوں، لیکن کتنی ہی اچھی بکری کیوں نہ ہو میں اُسے اپنے کسی کمرہ میں نہ گھسنے دوں گا، رہا یہ امر کہ جانور دوسروں کے یہاں کس طرح رکھے جاتے ہیں، تو وہ میرا فعل نہیں"

نواب صاحب نے ذرا زور زور سے سانس لیتے ہوئے جواب دیا،

"ٹھہرو ٹھہرو" سر فیضی نے ہانپتے ہوئے کہا، "وہ میرا فعل نہیں"....

.... میرے اللہ"

سر فیضی کا اضطرار و اضطراب اس قدر واضح اور نمایاں تھا کہ نواب صاحب کو اس کا احساس نہ ہوتا تو تعجب تھا،

"کیا میرے منہ سے کوئی ایسا لفظ نکل گیا جو بارِ خاطر ہوا" انھوں نے طنزیہ لہجہ میں دریافت کیا،

"نہیں نہیں، کوئی بات نہیں، ــــــ مگر میں اجازت نہیں دے سکتا، اجازت نہیں دے سکتا، نہیں دے سکتا، میں اس سے بیشتر موت گوارا کروں گا" سر فیضی نے بلند آواز سے کہا،

"کا ہے کی اجازت نہیں دیسکتا" رضیہ نے دریافت کیا،

سر فیضی نے ایک لمبی سانس لی "تم خوب جانتی ہو کہ کس بات کی کہ

اب بھی تم اس نواب مسخرے سے شادی پر تلی ہوئی ہو، تم اب اس کی بیوی نہیں ہو سکتیں، وہ بالکل پاگل ہے، مطلق پاگل، سراسر پاگل"

لیڈی فیضی گھبرا کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ رضیہ نواب صاحب کی طرف بڑھی، جو حیرت و استعجاب کا اسٹیچو ہو رہے تھے، ان کو شان گمان بھی نہ تھا کہ ان کی بابت بھی پاگل پن کا قیاس کیا جا سکتا ہے، وہ تو خود سر فیضی کو سنکی سمجھے ہوئے تھے۔

"چچا جان"

"اختر"

"مجھے نہ چچا جان کہو نہ اختر، میں کبھی اجازت نہیں دے سکتا، وہ بالکل دیوانہ ہے بالکل دیوانہ"

نواب صاحب کو احساس ہوا کہ سر فیضی کی حالت اس وقت بہت خطرناک ہے، انھیں خوب معلوم تھا کہ دوران دیوانگی میں کسی دیوانے کی تردید کرنا بہت بڑی غلطی ہے، اس لیے انھوں نے سر فیضی کو دھیما کرنے کی غرض سے کہا،

"شاید میرے کسی جملے سے آں جناب کو یہ خیال ہوا کہ میں جانوروں سے شوق نہیں رکھتا ہوں، میرا مطلب یہ ہرگز نہ تھا، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مجھے ان سے بیحد شغف ہے، مگر میں انھیں اپنے سجے سجائے کمرے میں اس قسم کی بنو حرکتیں کرنے دوں، یہ ناممکن ہے"

سر فیضی کا منہ سندور کے منہ سے زیادہ سرخ ہو گیا۔

"ادھر دیکھیے، نواب صاحب" انھوں نے بمشکل کہا اور پھر آواز یاری نہ کر سکی، اور وہ چپ ہو گئے،

"جی فرمائیے"

"آپ اپنی اس بکری کو کمرے سے باہر لیجائیے ورنہ بخدائے لایزال، میں ایک بندوق لے کر آپ اور آپ کی بکری دونوں کو ہلاک کر دوں گا"۔

"کیا فرمایا آپ نے؟ اپنی بکری کو" نواب صاحب نے اچنبھے کر پوچھا،

"آپ کی بکری، آپ کی بکری، جی ہاں۔ نواب صاحب، آپ کی" سر فیضی نے نواب صاحب کی ٹھوڑی کے نیچے بند مٹھی ہلاتے ہوئے کہا،

آنے کے بعد سے پہلی بار نواب صاحب کا سکون اور سنجیدگی سب رخصت ہو گئے، اور وہ دہم سے کرسی پر گر پڑے، ان کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا، بکری خراماں خراماں آکر ان کے قریب کھڑی ہو گئی، نواب صاحب نے اسے گھور کر دیکھا۔

"مے ..... میر ..... میری بکری" انھوں نے کمزور اور نحیف آواز میں کہا،

"جی ہاں، آپ کی بکری، اسے لے جائیے، قبل اس کے کہ میں اس کو اور آپ کو دونوں کو نقصان پہونچاؤں"

نواب صاحب بمشکل کوشش کر کے کھڑے ہوئے تھے، پھر دہم سے کرسی پر گر پڑے۔

"مگر یہ بکری تو میری نہیں ہے، میں نے آج سے پہلے اس کو دیکھا بھی نہ تھا"

"اس سے پیشتر کبھی دیکھا بھی نہ تھا" سر فیضی نے بصد دشواری کہا،
"کبھی نہیں ۔ میں تو یہہ سمجھا کہ یہ آپ کی ہے"

اب سر فیضی کا نمبر تھا کہ وہ بھد سے گر پڑیں ۔ دو تین بار انھوں نے حلق چلایا، مگر آواز نہ نکلی، بڑی کوشش کے بعد انھوں نے کہا،

"آپ یہ سمجھے کہ میری ہے' میں یہ دریافت کرتا ہوں کہ کیا آپ نے مجھے اتنا عقل سے خالی سمجھا تھا، جتنا حصۂ بیاکھ میں خرگوش" ؟

"مجھے خیال تک نہیں پیدا ہوا کہ یہ آپ کی نہیں ہے' اس پر مجھے تعجب ضرور ہوا کہ آپ جانوروں کے کیسے شوقین ہیں کہ تمام کمرہ اسے برباد کرنے دے رہے ہیں، لیکن یہ میرا منصب نہ تھا کہ میں اس پر اعتراض کرتا" نواب صاحب نے متانت سے جواب دیا،

"لیکن بکری آپ کے ساتھ کمرے میں آئی تھی، میں نے اسے خود آتے دیکھا" سر فیضی نے کمزور آواز میں کہا"

"ویسے تو آپ کا بٹلر بھی میرے ہمراہ کمرے کے اندر آیا تھا، تو اس سے کچھ وہ میرا بٹلر نہیں ہو گیا"

"پھر یہ بکری آخر کس کی ہے، اگر عبداللہ نے اس کا کوئی معقول جواب نہ دیا تو میں اس کا سر تڑوا ڈالوں گا"

رضیہ جواب تک غم و غصہ، تعجب و حیرت، سے بت بنی کھڑی تھی کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

"چچا جان، کیا آپ نے عبداللہ سے نہیں کہا تھا کہ نواب سعید الدین خان جانوروں کے بہت دلدادہ ہیں اور اگر ان کے ہمراہ کوئی جانور ہو تو اسے بھی ڈرائنگ روم میں آنے دیا جائے"

"اختر تم نے کہا تھا، میں نے خود تمہیں کہتے سنا تھا" لیڈی فیضی نے کہا۔

"ہاں ہاں میں نے کہا تھا، لیکن مجھے یہ خیال نہ تھا کہ بکری ساتھ آئے گی، کمبخت کو دیکھو، اب ایرانی قالین کھائے جا رہی ہے، کھانے دو مردار کو، اب رہا ہی کیا ہے جو اسے روکا جائے"..........

........"نواب صاحب میں معافی چاہتا ہوں اور شرمندہ ہوں کہ ......"
سر فیضی نے شروع کیا۔

"شرمندگی یا معافی مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں، سب کچھ غلط فہمی کی بنا پر ہوا، اب مجھے بھی آپ کے روبرو ایک اقبال کرنا ہے"
سر فیضی "اقبال" کا لفظ سن کر اچھل پڑے۔

"سنیئے حضرت، کہیں آپ یہ کہنے والے تو نہیں ہیں کہ یہ بکری اصل میں آپ ہی کی ہے میں ابھی بتائے دیتا ہوں کہ میں اس کی تاب نہ لاسکوں گا۔
"نہیں نہیں سر فیضی ---- بلکہ آپ کو چونکہ پیشتر ہی سے معلوم ہو گیا کہ

معلوم ہے، لہٰذا میں اس کا اقبال کرتا ہوں کہ مجھے رضیہ سے عشق ہے، اور میں اس کا خواستگار ہوں کہ آپ میری اور ان کی شادی کی اجازت عطا فرمائیں"

مسٹر فیضی خاموش رہے — "بولو، بولو، اختر، بولو" لیڈی فیضی نے پنکھا ہلاتے ہوئے کہا ۔ مسٹر فیضی پھر بھی نہیں بولے، بلکہ ادھر اُدھر دیکھا اور رضیہ کی خوشی سے روشن آنکھیں دیکھ کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر وہ آگے بڑھے کہ نواب صاحب کے ہاتھ میں دے دیں ۔ اتنے میں بکری نے پیچھے سے مسٹر فیضی کے ٹکر ماری، وہ تو دھم سے گر پڑے، اور مس رضیہ جھٹکے کے زور سے نواب صاحب کے آغوش میں تھیں ۔

۷۔ جو غم ہوا' اسے غمِ جاناں بنا دیا

(۱)

"شیریں، اگر تم سچ جواب دینے کا وعدہ کرو تو میں ایک سوال کروں۔ آخر تم نے یہاں مجھ میں کونسی ایسی بات دیکھی' جو میری محبت کو گوارا کیا' اور اس کی قدر کی ۔ دنیا میں صرف تین چیزیں ہوتی ہیں' جن کی طرف کسی کا رجحان ہو سکتا ہے' حسن صورت' وہ مجھے قدرت نے عطا نہیں کیا۔ دولت تو خود تمھارے پاس دولت کی کیا کمی ہے' رہی قابلیت' سو اس خصوص میں بھی مجھے کوئی غیر معمولی اور نمایاں امتیاز حاصل نہیں ہے' علاوہ بریں لیاقت علمی میں تم خود کس سے کم ہو' جو میری معمولی قابلیت تم کو متاثر کر سکے' پھر آخر کونسی خوبی تم نے مجھ میں ایسی پائی' کیا صفت مجھ میں ایسی دیکھی کہ اگر میں تم پر جان نثار کرتا ہوں تو تم بھی میری دلدادہ ہو' میں تم سے خلوص قلب سے محبت کرتا ہوں تو تم بھی مجھ سے دل سے عشق رکھتی ہو' آج دنیا میں مجھ سے زیادہ خوش قسمت کون ہوگا' دولت' عزت' شہرت سب خدا کے فضل سے پہلے ہی سے تھیں' اب ایک محبت کرنے والی' حسین' باعصمت اور لائق بیوی بھی ملنے والی ہے۔"

"محبت" شیریں نے سنجیدگی سے جواب دیا" صرف محبت کی غرض سے کی جاتی ہے، اس میں کسی اور جذبے، کسی اور لالچ کو دخل نہیں ہوتا، حسن صورت، قابلیت، دولت، یہ سب چیزیں عارضی اور اضافی ہیں، محبت اگر کسی عارضی شئے کی غرض سے کی جائے تو وہ محبت نہیں، محبت جاودانی اور ابدی ہے، اور جسم انسانی کے مٹ جانے کے بعد بھی باقی رہتی ہے، اگر محبت کی بنا کوئی عارضی شئے مثل حسن صورت یا دولت کے ہوتی تو موت محبت کا خاتمہ کر دیا کرتی، کیونکہ موت سے یہ چیزیں بھی ختم ہو جاتی ہیں، تعجب ہے کہ تمھاری سی ذہانت کا آدمی اتنا مادہ پرست ہو، پرویز تمھاری ہی ان باتوں سے مجھے کبھی کبھی گمان ہوتا ہے کہ تم کو مجھ سے سچی محبت نہیں، تم صرف میری صورت اور میرے جسم سے محبت رکھتے ہو، سچ بتاؤ۔ اگر میں اتنی خوبصورت نہ ہوتی تو بھی کیا تم کو اسی قدر عزیز ہوتی جتنی اب ہوں"

"شیریں" پرویز نے آنسو بھری آنکھوں سے جواب دیا" کیا تم مجھے واقعی اتنا سطحی سمجھتی ہو، کیا تم درحقیقت مجھ کو اس درجہ مادہ پرست تصور کرتی ہو، یقین کرو کہ تم جس زمین پر قدم رکھتی ہو وہ زمین مجھے عزیز ہے، تم جس چیز کو چھو لیتی ہو وہ چیز مجھے پیاری ہے، یہ کیونکر ممکن ہے کہ حسن اور خوبصورتی زائل ہو جانے کے بعد میں تم کو بھول جاؤں، تمھاری محبت کو فراموش کر دوں، شیریں تم مجھے اس لئے عزیز نہیں

ہو کہ تم حسین اور خوبصورت ہو، بلکہ اس لئے کہ تم شیریں ہو“

پرویز اور شیریں، سائنس کی اعلیٰ جماعتوں میں ہم جماعت رہ چکے تھے، اور دونوں کا شمار ذہین طالب علموں میں تھا، لیکن شیریں کی ذکاوت کی برتری تھی، کہ ایم، ایس سی، میں وہ اوّل آئی، یکجہتی اور قابلیت کے سبب سے دونوں کو ابتدا ہی سے ایک دوسرے سے بہت اُنس تھا، جو رفتہ رفتہ عشق میں تبدیل ہوگیا، پرویز کے والدین میں سے کوئی بقید حیات نہیں تھا، گھر پر وہ تنہا رہتا تھا، اُس کا چھوٹا بھائی جہانگیر انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم پا رہا تھا، بہت سی جائداد تھی، جو دونوں بھائیوں کی ضروریات کے لئے کافی تھی، پرویز کالج میں کیمیا کا لکچرار تھا، اس نے اپنے گھر پر بھی ایک مختصر سی تجربہ گاہ بنائی تھی، جہاں خالی وقت میں وہ تحقیق و تدقیق میں مصروف رہتا تھا، شیریں کے باپ اس کے بچپن ہی میں مرگئے تھے، ماں البتہ زندہ تھی، باپ نے بیوہ اور بیٹی کے لئے کثیر روپیہ اور جائداد چھوڑی تھی، شیریں کو کیمیا سے بہت شغف تھا، پرویز اس کا منگیتر تھا، اس لئے جب سے کالج چھوٹا، اس نے اپنا یہ معمول کر لیا تھا کہ روزانہ سہ پہر کو کچھ وقت پرویز کے ہمراہ اس کی لائبریری یا تجربہ گاہ میں گزارتی۔

پرویز شیریں سے باتیں کر رہا تھا، اور ایک شیشے کے برتن کو گرم کرتا جاتا تھا، برتن میں ایک سیال شئے تھی، یکایک اس میں جوش آنے لگا، پرویز تو اس طرف متوجہ تھا نہیں، لیکن شیریں کی نظریں اس پر جمی تھیں،

سپتال کی یہ حالت دیکھ کر اس نے چیخ ماری اور لپک کر پرویز کو ڈھکیل کر اس کی جگہ سے ہٹا دیا، پرویز ابھی واقعے کو پوری طرح سمجھ کر اپنے خیالات مجتمع نہ کرنے پایا تھا کہ بڑی زور سے دھماکا ہوا، برتن پھٹ گیا اور شیریں بے ہوش ہو کر گر پڑی، چند لمحوں تک پرویز سناٹے میں رہا۔ رفتار واقعات کی سرعت نے اس کی قوت خیال سلب کر لی تھی، اس کے بعد اسے حادثہ کی اہمیت کا اندازہ ہوا، دوڑتا ہوا باہر گیا، موٹر نکالی، اور فوراً سول سرجن کو لے کر آیا، راستے میں اس نے مجمل حالات ڈاکٹر سے بیان کر دیئے تھے۔ خود بھی اس کے ہمراہ تجربہ گاہ میں گھسنے لگا، تو ڈاکٹر نے روک دیا، اضطراب و پریشانی کے مارے پرویز کا برا حال تھا، شیریں کا مکان قریب تھا دوڑتا ہوا گیا، اور اس کی ماں کو ساتھ لے کر واپس آیا تو معلوم ہوا کہ سیول سرجن مریضہ کو لے کر اسپتال چلا گیا ہے، جو وہم اب تک محض وہم اور خوف تھا اب یقین کی حد کو پہنچ گیا، اسے شیریں کی زندگی سے یاس ہو گئی، ہاتھ پاؤں کانپنے لگے، ٹانگوں نے جواب دیدیا، دماغ نے کام کرنا بند کر دیا اور پرویز بیہوش ہو کر گر پڑا، شیریں کی ماں نے یہ دیکھا تو فوراً دوسرے ڈاکٹر کو بلوا کر پرویز کو اسکے سپرد کیا اور خود شیریں کے پاس اسپتال چلی گئی، پرویز کی بے ہوشی ہی میں سول سرجن نے ٹیلیفون سے اطلاع دی کہ شیریں کے علاج کا مناسب انتظام اسپتال میں کر دیا گیا ہے، اس کی ماں اس کے پاس ہے اور امید کی جاتی ہے کہ اس کی جان بچ جائے گی،

دوسرے روز پرویز اس قابل ہوا کہ خود اسپتال جا سکے، کمرے یا وارڈ کا نمبر تو اسے معلوم نہ تھا، اسپتال کے ایک ملازم سے کہا "کل جو عورت تیزاب سے جلنے کے سبب دواخانے میں لائی گئی ہے، اس کے کمرے میں مجھے پہنچا دو" قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے، جس روز شیریں کو یہ حادثہ پیش آیا تھا، اُسی روز ایک اور نوجوان لڑکی اسپتال میں داخل کی گئی تھی، اس لڑکی کا شوہر بہت ظالم اور غصہ ور تھا، کسی بات پہ غضبناک ہوکر اس نے گندک کے تیزاب کی ایک بوتل بیوی کے منہ پر الٹ دی تھی۔ اس ملازم نے غلطی سے پرویز کو اس لڑکی کے کمرے میں پہنچا دیا، وہاں صرف ایک نرس موجود تھی جسے یہ اطلاع دی جا چکی تھی کہ اس لڑکی کا بھائی اُسے دیکھنے آنے والا ہے، قدرتاً نرس نے پرویز کو لڑکی کا بھائی سمجھا اور خاموش رہی، پرویز مریضہ کے پلنگ کے پاس گیا، نرس نے چادر ہٹا کر مریضہ کا چہرہ کھول دیا، پرویز نے کراہت سے منہ پھیر لیا اور آنکھوں پر ہاتھ رکھے باہر آیا، وہاں سے گھر پہنچا، اسباب درست کیا، ویزا لیا، اور اسی ہفتے میں ہندوستان چھوڑ دیا۔——

شیریں کے زخم کچھ ایسے خطرناک نہ تھے، برتن پھٹتے وقت قدرتاً اس نے اپنا بازو منہ پر رکھ لیا تھا، جس کے سبب سے اس کا چہرہ بالکل محفوظ رہا۔ صرف چند خراشیں آئیں، جو جلد ہی اچھی ہوگئیں، شانہ اور ہاتھ البتہ بری طرح جلے تھے، ان کی صحت میں دیر لگی، جب شیریں تندرست

ہو کر اسپتال سے نکلی تو اسے پرویز کے غائب ہو جانے کا علم ہوا، اس نے بہت تلاش کی، مگر پتہ نہ چلا، رفتہ رفتہ اُسے یہہ معلوم ہوا کہ پرویز اُسے دیکھنے کے لئے ایک روز بھی شفاخانے نہیں آیا، اس نے تحقیق کی تو پرویز کی غلط فہمی کا علم ہوا، اب اُسے اس کا احساس ہوا کہ پرویز نے اس دھوکے میں کہ شیریں جلنے سے بدصورت ہو گئی ہے اُس سے کنارہ کشی کی ہے، اس احساس سے اسے بہت صدمہ ہوا، سوچتی تھی کہ میں نے تو اپنی زندگی، اپنی خوبصورتی، سب کچھ پرویز کی خاطر خطرے میں ڈالی اور پرویز سے اتنا بھی نہ ہوا کہ میرے صحت پانے تک ٹھہرتا، اسی دوران میں اسے آخری روز کی گفتگو یاد آئی، کہ پرویز کے نزدیک محبت کی بنا صرف عارضی چیزیں ہو سکتی تھیں ان تمام خیالات کے ہجوم نے اس کے دل و دماغ کو بہت متاثر کیا، اس پر طرہ یہہ ہوا کہ بیٹی کی یہ مصیبت ماں سے نہ دیکھی گئی اور شیریں کی تندرستی کے چند ماہ بعد وہ مر گئی، شیریں بیچاری یوں ہی کیا غمزدہ تھی، ماں کی موت کے صدمے نے اسے پاگل بنا دیا، منہ پر نقاب ڈالی، خدا کا نام لیا اور نکل کھڑی ہوئی۔

پرویز نے ہندوستان چھوڑا تو سیدھا انگلستان بھائی کے پاس پہنچا، کچھ دنوں وہاں رہا، پھر یورپ کی سیاحی کرتا ہوا امریکہ چلا گیا، کیمیا سے اسے بہت ذوق تھا، امریکہ کی ایک یونیورسٹی میں کچھ دنوں تحقیق کا کام کیا، آدمی لائق تھا، دو ایک برس میں ڈاکٹریٹ مل گئی، اس کے پروفیسر کی لڑکی حسین تھی اور مالدار، پرویز کو شیریں کی تو اب یاد بھی نہ آتی تھی، اس لڑکی کو دیکھا

تو لٹو ہو گیا، آدمی خود بھی وجیہہ تھا، درخواست عقد منظور ہوئی اور شادی ہو گئی، ایک سال کے بعد ایک لڑکا ہوا، جس کی پیدایش میں ماں کا انتقال ہو گیا، پرویز کو بیوی کی موت کا بہت دھچکا لگا، کچھ دنوں بیمار رہا۔ پھر ڈاکٹری کا مطالعہ شروع کر دیا، اور اپنی ذہانت اور ذکاوت کی وجہ سے سات سال میں سول سرجن کے درجے پر جا پہنچا اور سیول سرجن بھی کیسا؟ دو چار میں نہیں، ہزاروں میں ایک ہندوستان چھوڑے اسے دس برس سے زیادہ ہو چکے تھے، وطن کی یاد نے اب ستانا شروع کیا، اپنے لڑکے ہمایوں کو ساتھ لیا اور گھر واپس آیا، لڑکے کو انگریزی اسکول میں داخل کرا دیا اور خود مطب کرنے لگا ــــ

(۲)

شیریں کے جلنے کے حادثہ کو پچیس۲۵ برس گذر گئے، جہانگیر خواب اسی شہر میں بیرسٹری کرتا تھا، اس واقعے سے بالکل لاعلم تھا، دو چار جاننے والے جو اور تھے اُن میں سے بھی بعض مر مرا گئے، بعضوں کے دماغ سے امتداد زمانہ کے ساتھ یہہ واقعہ بھی بالکل محو ہو گیا، شیریں کا مکان پچیس۲۵ برس سے یوں ہی بند پڑا تھا، مکان سے ملحق باغ تھا، جو نگرانی نہ ہونے کے سبب سے برباد ہو چکا تھا، بہار آتی تھی لیکن خود رو بیلوں اور خاردار درختوں کے سبب سے بمشکل پھول سطح تک پہونچتے تھے، ابتدائے خزاں میں رنگ برنگ کے کانٹے دار خود رو پودے نکل آتے تھے جو رفتہ رفتہ تمام

باغ کی زمین پر پھیل گئے تھے انھوں نے پھاوں کے درختوں کو یکسر پوشیدہ کر لیا تھا ٹوٹے ہوئے پھاٹک کے قریب ایک شاندار صنوبر کا درخت تھا، اور اس کے عین مقابل ایک گلاب کا خوشنما پودا جس میں ہر سال بہار کے موسم میں خوشرنگ گلاب کا ایک پھول نکلتا تھا، اسی پھاٹک سے محبت گھر میں داخل ہوئی، اور اسی پھاٹک سے باہر چلی گئی، مگر محبت کی نشانی یہ پھول رہ گیا تھا، دروازوں پر زنگ لگ گیا تھا، کھڑکیوں پر مکڑی کا جالا آ گیا تھا، ایک کمرے میں میز پر چند کتابیں پڑی ہوئی تھیں، ایک طرف کچھ صندوق رکھے ہوئے تھے، ایک الماری میں کشیدہ کاری کا کچھ سامان تھا ——— آدھی رات کا وقت تھا، ہوا زور سے چل رہی تھی کہ نقاب ڈالے ہوئے ایک عورت پھاٹک سے باغ میں داخل ہوئی اور دفعتاً ٹھٹک کر رہ گئی، یہ معلوم ہوتا تھا غور کر رہی ہے کہ مکان میں داخل ہو یا واپس چلی جائے، کچھ دیر سوچنے کے بعد وہ مکان کی طرف بڑھی، اس کی رفتار سے واضح تھا کہ وہ خود پر بہت جبر کر رہی ہے اور ہر قدم جو اٹھتا ہے اس کے قلب کے لئے تیر و نشتر کا کام کرتا ہے، مگر وہ ان لوگوں میں نہ تھی جو تکلیف کے وقت چلّا اٹھتے ہیں، خاموشی سے وہ مکان میں داخل ہوئی، اور اندر پہنچکر نقاب الٹ دی، ——— شیریں ——— لیکن کون شیریں، بیس برس کی خوش مزاج اور ہنس مکھ شیریں نہیں، پینتالیس برس کی غمزدہ اور دکھیاری شیریں جس کے بالوں میں سفیدی آ چلی تھی، جس کے چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں، نہ

کے صدمات بہت مکلف اور دیرپا ہوتے ہیں، بیسویں برس دنیا کی خودغرضیوں کے اتنے تلخ تجربے نے اس کے بالوں کی رنگت بدل دی تھی، وقت کا تشیت سے وقت اب اس کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتا تھا، صدمات کی اس پر اتنی بارش ہوئی تھی کہ صدمات کا اب اس کو احساس و ادراک نہیں تھا۔ بچپن میں اُسے تعلیم دی گئی تھی کہ خدا اپنے بندوں پر ہمیشہ مہربانی کرتا ہے، اور اپنی زندگی کو اپنے ہاتھ سے ختم کرنا گناہ عظیم ہے، خدا کی اس مہربانی کی چاشنی سے وہ اس وقت تک محروم تھی، لا محالہ اُس کے ذہن میں خدا کے وجود کے متعلق بھی شکوک پیدا ہو چلے تھے، اور اسی کے ساتھ ساتھ یہ خیال بھی جڑ پکڑ گیا تھا کہ جب زندگی کی تکلیفیں ناقابل برداشت ہو جائیں تو خودکشی کر لینا حرام نہیں، لیکن ابھی تک کسی نہ کسی طرح وہ اس فعل کے ارتکاب سے باز رہی تھی، اس نے کمرے میں روشنی کی، اور ایک بکس کھولا کہ بچھانے کے لئے کچھ نکالے، صندوق میں کچھ کپڑے تھے اور کپڑوں کے اوپر ایک چھوٹا سا بھورے رنگ کا چمڑے کا ڈبہ رکھا تھا، جو باوجود زیادہ دنوں کا ہونے کے اب بھی گویا کہ نیا تھا، رنگ میں البتہ کچھ پھیکا پن آ چلا تھا شیریں نے اُسے کھولا، ایک موتیوں کا ہار اس کے اندر تھا، وقت زیادہ گزرنے سے موتیوں کی آب و تاب ماند ہو چکی تھی، دو ایک بالکل سیاہ پڑ گئے تھے، ڈبہ کھولتے ہی کاغذ کا ایک پرزہ اڑ کر نیچے گرا، شیریں نے اس کو اٹھا کر پڑھا، کاغذ زرد ہو چکا تھا، روشنی کہیں کہیں مٹ گئی تھی، لیکن الفاظ اب بھی

پڑھے جاتے تھے، پرویز کے صاف اور دلکش خط میں لکھا تھا ——
"پہلے قلب سمندر سے، پھر میرے محبت بھرے قلب سے پیاری شیریں کے لئے" —— شیریں نے موتیوں کو ہاتھ میں لیا اور غور سے دیکھا، آنکھوں میں آنسو آگئے، عمر میں پہلی بار اُسے اپنے پر ترس آیا۔ لیکن ضبط کر کے آنسو پونچھے، موتیوں کو ایک کپڑے میں لپیٹ کر اسی بکس میں رکھ دیا، ہاتھ میں جو چھوٹا سا بیگ تھا، اسے کھول کر کچھ کھاتے کو نکالا، کھانے سے فارغ ہو کر ہاتھ پونچھے، بیگ بند کر کے الگ رکھ دیا، روشنی گل کی، اور ایک کرسی پر بیٹھ کر، دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا اور اسی طرح سو گئی،

—— (۳) ——

پرویز کے مکان کے دو قطعے تھے، ایک میں جہانگیر رہتا تھا، دوسرے میں پرویز، جہانگیر چالیس کے لگ بھگ تھا، مگر غیر شادی شدہ طبیعت کے لحاظ سے وہ فلسفی تھا، دونوں بھائیوں میں موانست اور اتحاد بہت تھا اور پرویز کو اپنی ذات کے علاوہ کسی سے اگر تعلق تھا تو وہ بیٹے سے یا بھائی سے،

صبح کو جہانگیر پرویز کے ساتھ اس کی لائبریری میں ناشتہ کرتا تھا، ناشتے کے دوران میں اور اس کے کچھ بعد تک دونوں بھائی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے، پھر جہانگیر اپنے دفتر چلا جاتا تھا، پرویز اپنے کام میں مشغول ہو جاتا تھا:

پندرہ برس میں پرویز کی قابلیت کی دور دور دھوم ہوگئی تھی، یہ مشہور تھا اور بالکل بجا طور پر کہ وہ بہت سنگدل اور خودغرض ہے اور واقعہ یہ ہے کہ اس کی سنگدلی اور خودغرضی میں کلام نہ تھا، بغیر کسی قسم کی تامل و تامل کے وہ ایک شخص سے یہ کہہ دیتا تھا کہ اس کی بیوی گھنٹہ بھر میں مر جائیگی، بلا پلک جھپکائے وہ والدین کو نانیوں کی صحت کے ساتھ اولاد کی موت کا وقت بتا دیتا تھا، لوگ اس کی عزت کرتے تھے، اس سے ڈرتے تھے، اس کی قابلیت کے، اس کی جراحی کے معترف تھے، لیکن بجز اس کے لڑکے اور اس کے بھائی کے دنیا میں کوئی تیسرا آدمی نہیں تھا، جو اس سے محبت کرتا ہو،

صبح کا وقت تھا، پرویز اپنی لائبریری میں تنہا بیٹھا ہوا تھا، سامنے میز پر ہمایوں کے خط پڑے ہوئے تھے جو اس نے وقتاً فوقتاً کالج سے باپ کو لکھے تھے، ـــــ پرویز ان کا مطالعہ نہیں کر رہا تھا، دراصل یہ سب خط اُسے ازبر تھے، لیکن اس پر بھی وہ روز صبح کو انھیں ایک بار پڑھتا ضرور تھا، عجیب بات تھی کہ مگر آج وہ اپنے خیالات کو ان پر مجتمع نہیں کر پاتا تھا، جب وہ انھیں پڑھنے کی کوشش کرتا اس کی آنکھوں کے سامنے ایک بیس سالہ ہنس مکھ، حسین دوشیزہ کا چہرہ آجاتا تھا، متعدد بار اس نے کوشش کی کہ وہ چہرہ اس کے سامنے سے ہٹ جائے، آنکھیں بند کرلیں مگر وہ تصویر غائب نہ ہوئی، بیوی کا فوٹو سامنے رکھا ہوا تھا، خیال ہٹانے کی غرض سے اُسے اٹھا کر دیکھنے لگا، وہ کتنی خوبصورت عورت تھی، اور کیسی لاجواب بیوی۔

مجھے اُس سے بڑی محبت تھی" لیکن معاً اُس کے دل میں یہ خیال آیا کہ جس عورت سے اسے حقیقت میں الفت تھی وہ اس صورت کی ملکہ ہے، جو صبح سے بار بار اس کے پیش نظر ہو جاتی ہے، زندگی میں پہلی بار اس کے دماغ میں اس اصلیت نے جگہ پائی کہ ہر ذی روح کے لئے قدرت ایک مخصوص ہمدم ودیعت کرتی ہے، شیریں کا خیال آتے ہی اُسے خیال آیا "معلوم نہیں، شیریں اب کہاں ہے، زندہ ہے یا مر گئی" اس نے اس کا احساس کیا کہ وہ اور شیریں ایک دوسرے کے لئے بنے تھے، قسام ازل نے انھیں ازلی کے روز ہی متحد کر دیا تھا، شیریں خوبصورت ہو یا بدصورت، لنگڑی ہو یا لولی ہر حال میں پرویز شیریں کے لئے تھا، اور شیریں پرویز کے لئے" اب اُسے اندازہ ہوا کہ ہمایوں کی ماں کبھی اس کے دائرۂ محبت میں داخل ہی نہیں ہوئی تھی، اس کی جانب جو کچھ رجحان اسے تھا وہ محض عارضی اور سطحی تھا، لیکن اس امر کا اندازہ ہونے پر بھی اس کی عقل میں نہ آیا کہ ہمایوں کی ماں کو بھی اس امر کا ادراک ہو گیا تھا، اور یہ ادراک ہی بڑی حد تک اس کی جوانمرگی کا باعث ہوا ——— پرویز اس کا ممنون تھا، اس کی وجہ سے ہمایون عالم وجود میں آیا، لیکن بس، اسی حد تک، اس سے زیادہ منت پذیر ہونا اس کے خیال میں غلطی تھی، اس کا کلیہ تھا کہ بیوی ایک تیتری کی شکل ہوتی ہے جو باغ میں آتی ہے، اس پھول پر بیٹھتی ہے، اس شاخ پر منڈلاتی ہے، اس کلی سے دل بہلاتی ہے، پھر چلی جاتی ہے ——— مگر شیریں ایک کلیۃً

علیحدہ شئے تھی، پرویز باوجود کوشش کے اُسے بھول جانے میں کامیاب نہیں ہوا تھا ـــــ اسی قسم کے خیالات اس کے دماغ میں چکر لگاتے رہے، دیر تک خاموش بیٹھا وہ ان پر غور کرتا رہا، پھر اُٹھا، اور اپنی میز کے ایک خانے کو جو عرصہ دراز سے بند تھا کھولا، اس میں سے ایک تصویر نکالی، اور کھڑے کھڑے اُسے دیکھنے لگا، وہ نہایت دلاویز آنکھوں نے اس کے چہرے پر ٹکٹکی لگا دی، یہ تصویر شیریں کی تھی، شیریں، عروج حسن کی حالت میں، تصویر کا چہرہ محبت کے نور سے روشن تھا، پرویز دیر تک اس کامل اور مکمل نمونۂ حسن و نسوانیت کو دیکھتا رہا، وہ شوخ اور شیریں لب، وہ بڑی بڑی دل میں گھر کر لینے والی آنکھیں، وہ کالے کالے چمکدار، گھونگر والے بال ـــ اس چہرے میں عزم بھی تھا، اور نزاکت بھی حُسن بھی تھا اور استقلال بھی ـــــ

"مرد کے لئے بہترین ہمدم" پرویز نے اپنے خیالات کو بآواز بلند ظاہر کیا "ایسی ہی عورتیں ہوتی ہیں جن کے ملنے کی ہوس مردوں کو دنیا و مافیہا سے بے نیاز بنا دیتی ہے، جن کے حصول کے لئے مرد دنیا کے بڑے سے بڑے خطروں کی پروا نہیں کرتا، یہی عورتیں ہوتی ہیں جو مردوں کو عروج تک پہونچانے کے بعد بھی عروج مابعد کے افسانے سناتی رہتی ہیں" ـــــــــــ دل ہی دل میں اس نے ہمایون کی مالکا شیریں سے موازنہ کیا، دونوں میں اتنا ہی تفاوت تھا، جتنا ایک عام راگ اور ایک مکمل نغمے میں ہو سکتا ہے، پرویز کو بھی اس کا احساس ہوا، اس نے سوچا، "شیریں کا شمار ان عورتوں میں ہے جو کمزور سے

کمزور ارادے کے مرد کو مستقل مزاج بنا دیں، مگر اس خیال کے ساتھ ہی اس کے دماغ نے اسے یہ سمجھایا کہ شیریں نے اس پر بڑا ظلم کیا ہے، کیا یہ شیریں کا قصور نہیں کہ آج وہ اپنے دل پر ایک گناہ عظیم کا بار لئے ہوئے ہے، فوراً پرویز نے شیریں کو اپنی کمزوریوں کا ذمہ دار گردانا شروع کیا، وہ انھیں خیالات میں غلطاں تھا کہ دروازے پر کسی کی آہٹ معلوم ہوئی، گھبرا کر پرویز نے تصویر میز کے خانے میں رکھدی اور دروازے کی طرف دیکھنے لگا، جہانگیر داخل ہوا اور دونوں بھائی ایک دوسرے سے باتوں میں مشغول ہوگئے، نوکر نے ناشتے کا سامان کیا، دونوں ناشتہ کرنے لگے، میز پر ہمایوں کی ماں کا فوٹو رکھا ہوا تھا، تصویر کی آنکھیں پرویز کے چہرے پر تھیں، باتیں کرتے کرتے جہانگیر نے نظر اٹھائی تو تصویر پر پڑی، کہنے لگا "بھائی صاحب، مجھے آپ پر رشک بھی آتا ہے، اور رحم بھی، رشک اس کا کہ جیسی حسین اور محبت کرنے والی بیوی آپ کو ملی تھی شاید ہی کسی کو ملے، اور رحم اس پر کہ قدرت نے اس کو آپ سے بہت جلد چھین لیا"۔

پرویز کے چہرے کا رنگ متغیر ہوگیا، اس کی نظروں میں پھر شیریں کی حسین اور ہنس مکھ صورت پھرنے لگی، بات ٹالنے کی غرض سے اس نے کہا جہانگیر قدرت کے کھیل کسی کی سمجھ میں نہیں آتے، جس دن سے ہمایوں کی ماں کا انتقال ہوا ہے، زندگی میں کوئی لطف نہیں رہا، لیکن قدرت کو اس کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں، اس نے تو جو چاہا کیا، بلا لحاظ اس کے کہ اس کی

ستم شعاری سے دوسرے کا کیا حال ہوا ۔“

”بھائی صاحب“ جہانگیر نے کہا ”یہ خیال آپ کا نادرست ہے، قدرت کے ہر فعل میں اس کی ایک مصلحت مضمر ہے، ہر کام میں ایک راز پوشیدہ ہے، آپ اور ہم اُسے سمجھتے نہیں، اس لئے بیتاب اور بے چین ہیں، آپ کا اضطراب بالکل مبنی بر انسانیت ہے، لیکن اس اضطراب میں بھی سکون کی ایک جھلک یہ اطمینان اور یقین ہے مجھ سے محبت کرنے والی ایک ہستی کہیں نہ کہیں ضرور میرا انتظار کر رہی ہے، اور میرے لئے چشم براہ ہے —— بہر حال اس گفتگو سے آپ کو اذیت ہوتی ہو گی، اس لئے اسے ترک کر دینا چاہیئے —— ہاں آج ایک عجیب واقعہ پیش آیا، میں سویرے چہل قدمی کے لئے نکلا تھا، ٹہلتا ٹہلتا اُس مکان تک چلا گیا، جو بیس برس سے خالی پڑا ہے، اور مجھے اس کے باغ میں ایک نقاب پوش عورت کو ٹہلتے دیکھ کر بڑا تعجب ہوا، میں ٹھہر کر اُسے دیکھتا رہا، مجھے کھڑا دیکھ کر وہ سڑک تک آئی، اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب پہلا سوال اس نے ہمارے مکان کے متعلق کیا کہ، وہ خالی ہے یا اس میں کوئی رہتا ہے، میں نے کہا کہ وہ میرا ہی مکان ہے، اور اس میں میں اور میرے بڑے بھائی ڈاکٹر پرویز رہتے ہیں، آپ کا نام سنتے ہی ایسا معلوم ہوا جیسے اس پر بجلی گر پڑی، ”پرویز ڈاکٹر پرویز کیا یہ وہی پرویز ہیں جو پہلے کالج میں کیمیا کے لکچرار تھے“ میں نے جواب دیا ”ہاں“ —— پھر اس نے کہا ”ڈاکٹر صاحب تو مفقود الخبر ہو گئے تھے

ہیں تیسا سے تمام حالات بتائے کہ" یرن آپ امریکہ میں رہے، یوں شادی کی، جس سے ایک لڑکا موجود ہے ڈاکٹری پڑھ رہا ہے اور اب دوچار روز میں واپس آنے والا ہے"_____ اس کے بعد میں چلا آیا، مگر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ عورت کون ہے، گفتگو سے تو وہ بہت شایستہ اور تعلیم یافتہ معلوم ہوتی ہے اور آپ کا تذکرہ اس نے اس طرح کیا، گویا آپ سے خوب واقف ہے، کیا آپ نے اسے پہچانا"

پرویز نے بےچینی سے کرسی پر پہلو بدلا، اس کا چہرہ زرد تھا، روح مضطر تھی کہ دل کی بھڑاس نکال دے، شیریں کی صورت پھر اس کے سامنے آگئی، اس نے کہا "ہاں میرا خیال ہے کہ وہ ڈنشا بیرسٹر کی لڑکی شیریں ڈنشا ہے، میں اس سے اور اس کے حالات سے خوب واقف ہوں، کالج میں وہ میری ہم جماعت تھی، اور بہت ذہین متعلمہ، پہلے وہ نقاب پوش نہیں رہتی تھی، لیکن کالج میں میرا ایک اور دوست تھا اس کو شیریں سے محبت ہو گئی اور شیریں کو اس سے، دونوں نے آپس میں شادی کرنے کا معاہدہ کر لیا، اس کے منگیتر کو کیمیا سے بہت دلچسپی تھی، کالج میں بھی اس کا مضمون کیمیا ہی تھا اور گھر پر بھی اس نے ایک تجربہ گاہ بنا رکھی تھی، شیریں اکثر اس کے ہمراہ تجربوں میں شریک رہتی تھی، شادی سے ایک دن پہلے وہ ایک خطرناک تجربے میں مشغول تھا، شیریں بھی موجود تھی، اتفاق سے چند کیمیائی اجزا میں آگ لگ گئی اور آے پھٹ گئے، قبل اس کے کہ حادثہ رونما ہو، شیریں نے دوڑ کر اس کو اس کی جگہ سے ہٹا دیا۔

اور حادثے کے تمام اثرات اپنے اُوپر لے لئے، اُس کا حسن ملیا میٹ ہو گیا، اور گو جان بچ گئی مگر وہ بدصورت اور بدقوارہ ہو گئی، منگیتر نے جب اس کی صورت دیکھی تو اُسے نفرت ہو گئی اور قبل اس کے کہ اُسے صحت ہو وہ ہندوستان چھوڑ کر بھاگ گیا، مجھے علم نہیں، آج کل وہ کہاں ہے، لیکن چند سال ہوئے اس کا ایک خط میرے نام آسٹریلیا سے آیا تھا، شیریں اسی زمانے سے نقاب پوش رہتی ہے" ـــــــ پرویز نے گفتگو ختم کی تو جہانگیر کی آنکھیں نم تھیں، اس نے کہا "بھائی صاحب! آپ نے دیکھا کہ آپ کے دوست نے شیریں کو اس کے ایثار کا کیا بدلہ دیا، وہ اسے اس وقت بے یار و مددگار چھوڑ کر چلا گیا، جب اسے مدد اور ہمدردی کی سخت ضرورت تھی"

"ہاں اگر یہ میری آنکھوں کا دیکھا واقعہ نہ ہوتا، تو شاید سن کر یقین نہ آتا کہ دنیا میں ایسا بھی ممکن ہے" پرویز کے منہ سے بے اختیار نکل گیا،

"ایک کتے کی بابت تو یقین آسکتا ہے لیکن ایک انسان کے متعلق نہیں" جہانگیر نے جواب دیا،

پرویز کا رنگ فق ہو گیا، کسی دوسرے کی زبان سے یہ الفاظ اتنے تکلیف دہ نہ ہوتے، مگر بھائی کی زبان سے یہ سن کر اس پر بہت اثر ہوا۔ "واقعے کو بہت دن ہوئے، کوئی پچیس برس" اس نے کہا، اس کی ہمت نہ پڑی کہ جہانگیر سے یہ بھی کہدے، "اس دوست نے شادی کر لی جس سے ایک لڑکا موجود ہے" اس نے جب مجھے خط لکھا تھا تو اس میں اس کا ذکر

بھی کیا تھا کہ اب وہ پشیمان ہے، اور اس کی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا تلافی کرے
تمھاری رائے میں اُسے کیا کرنا چاہیئے"

"اس کا اقرار آج تک باقی ہے، جو اسے اس امر پر مجبور کرتا ہے کہ
اس اقرار کو یا پورا کرے یا اس سے نجات حاصل کرے — اس نے شیریں
سے شادی کی درخواست کی تھی، شیریں نے اس کو منظور کیا تھا، آج تک اس
نے نہ اس اقرار کو پورا کیا نہ اس اقرار کے بندھنوں سے آزادی حاصل کی،
حتیٰ کہ شیریں سے معافی کی درخواست بھی نہیں کی، اُس پر طرہ یہ کہ اس نے
شیریں سے ایسا برتاؤ کیا جو کتے سے بھی بدتر ہے، اور اس طرح اپنے
جرم کو سنگین تر کر دیا! اس کے لیئے اب بجز اس کے اور کوئی راستہ نہیں
کہ یا شیریں سے عقد کرے یا اس سے معافی مانگ کر اپنے اقرار سے
نجات حاصل کرے۔ کم سے کم میرے دل میں تو ایسے انسان کے لیئے
ذرہ بھر بھی عزت نہیں ہو سکتی، اور نہ وہ کسی عزت کا مستحق ہے، یہ آپکی
عالی ظرفی ہے کہ آپ اسے دوست کے نام سے یاد بھی کر لیتے ہیں، بھائی
صاحب کیا ایسا ممکن نہیں کہ آپ اس کو بلوائیں، اور ہم آپ سعی کر کے اسے
اور شیریں کو ایک دوسرے سے پھر ملا دیں، بھائی صاحب آپ یقین
کیجیے کہ دنیا میں اس قسم کے افعال بدترین گناہ ہیں، میں ایک دروغ گو کو
معاف کرنے کے لیئے تیار ہوں، ایک چور کی خطا بخش سکتا ہوں، ایک قاتل
سے مجھ کو ہمدردی ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک دل توڑنے والے کا قصور معاف

کرنا ناممکن ہے"

جہانگیر کی آواز یہ کہتے کہتے گلوگیر ہوگی،

"مجھے علم نہیں، آج کل وہ کہاں ہے جو میں اُسے خط لکھوں" پرویز نے بمشکل جواب دیا،

"کس قدر افسوس کی بات ہے کہ ایک انسان اتنے عظیم گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لئے ہوئے خدا کے سامنے حاضر ہوگا"

جہانگیر کے اس جواب کے بعد کچھ دیر خاموشی رہی، پرویز کے دماغ پر اس فوری خاموشی کا بہت اثر ہوا، وہ کوشش کرتا تھا کہ بولے، مگر منہ سے لفظ نہیں نکلتے تھے، اس کشمکش سے وہ قریب قریب پاگل سا ہو گیا، جب سے الجھن ناقابل برداشت ہوئی تو وہ کھڑا ہو گیا، اس کے ہونٹ خشک تھے، زبان تالو سے لگی ہوئی تھی ....

"جہانگیر، جہانگیر، کیا تم اب بھی .... "ٹھہرئے" جہانگیر نے ہاتھ اٹھا کر جواب دیا "میرا خیال ہے کوئی آیا ہے، دروازے پر موٹر آ کر رکی ہے" ——— اتنے میں کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک خوبصورت نوعمر لڑکا داخل ہوا۔ پرویز دیوانہ وار آگے بڑھا، "پاپا، پاپا" ہمایوں نے کہا "میں آ گیا"

——— (۴) ———

جہانگیر سے یہ سن کر کہ پرویز نہ صرف پندرہ برس سے گھر پر موجود ہے

بلکہ اس نے امریکہ میں شادی کر لی تھی، شیریں کو نہ کوئی صدمہ ہوا نہ رنج۔۔۔۔
۔۔۔ تعجب اُسے ضرور ہوا، لیکن وہ پرویز کی بزدلی اور خود غرضی پر ۔۔۔۔۔
اب تک اسے گمان یہ تھا کہ پرویز سے یہ گناہ انتہائی اضطرار اور دیوانگی کی حالت میں ہوا تھا، یہ علم اوسے نہ تھا کہ یہ حرکت اس نے قصداً کی تھی، اور سال ہی بھر میں اس کی یاد پرویز کے دل سے اتنی محو ہو چکی تھی کہ اس نے دوسرا عقد کر لیا، صرف یہی نہیں، بلکہ وہ اپنے گھر واپس آگیا، جہاں کی ہر ہر چیز اُسے شیریں کی اور اپنی گزشتہ محبت کی یاد دلاتی ہوگی، اب اسے اس کا احساس ہوا کہ پرویز کی فطرت کو اس نے سمجھا ہی نہ تھا، اور پرویز اس کے گمان سے کہیں زیادہ کم ظرف اور خود غرض تھا، اگر گزشتہ محبت کے تمام اثرات اس کے دل میں موجود ہوتے تو یہ چیز اس کے لئے بہت ہی تکلیف دہ ثابت ہوتی، مگر اس اطلاع کے ملتے ہی وہ چنگاری بھی جو اب تک اس کے سینے میں دبی ہوئی تھی بجھ گئی، اور یہی سبب تھا کہ اسے تعجب تو ہوا تکلیف نہیں ہوئی، دن بھر وہ انہیں واقعات پر غور کرتی رہی، اسے اعتبار نہ آتا تھا کہ یہ وہی پرویز ہوگا، جو پچیس برس پیشتر اس سے اتنی عظیم اور والہانہ محبت کا اظہار کرتا تھا، شام کو اس کے دل میں دفعتاً پرویز کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی، نصف شب گزر چکی تو اس نے گھر سے قدم نکالا، پھاٹک سے گزرتے وقت اسکی نظر اس اکیلے گلاب کے پھول پر پڑی جو سالہا سال سے اس کی محبت کا نوحہ خواں تھا، رات چاندنی تھی، اور شبنم کے قطرے پھول پر موتی سے

چمکتے ہوئے معلوم ہوتے تھے، انھیں دیکھ کر اسے پرویز کے دئے ہوئے موتی یاد آ گئے، ایک نامعلوم جذبے کے تحت وہ پلٹی، اور موتیوں کا ڈبہ بھی ساتھ لے لیا۔ پرویز اور ہمایوں لائبریری میں تھے، لائبریری کی کھڑکیاں ٹینس کھیلنے کے لان کی طرف کھلتی تھیں، ہر سائے کا فائدہ اٹھاتی ہوئی، چھپتی، دبکتی، شیریں ایک کھڑکی کے پیچھے پہنچ گئی، کھڑکی پر چھجا لگا تھا، جس کے سائے میں وہ اندر سے نظر نہ آتی تھی، اس نے غور سے پرویز کو دیکھنا شروع کیا، سامنے میز پر ہمایوں کی ماں کا فوٹو رکھا ہوا تھا، دونوں باپ بیٹے اسی کے متعلق گفتگو کر رہے تھے، شیریں نے پھر خوب نظر جما کر دیکھا، پرویز میں گویا کہ کوئی تغیر نہیں ہوا تھا، عمر میں وہ اور شیریں قریب قریب برابر تھے، پرویز شاید دو ایک برس بڑا ہو گا! کنپٹیوں کے قریب ان کے بالوں میں سفیدی آ چلی تھی، ورنہ بائیس ۲۲ برس کے نوجوان پرویز اور سینتالیس ۴۷ سال کے ادھیڑ پرویز میں کوئی فرق نہیں تھا ــــ ہمایوں، شباب، مردانہ حسن اور شوخی کا مجسمہ تھا، شیریں کا دل بے اختیار اس کی طرف کھنچنے لگا، اس نے غور سے دیکھا تو اسے تعجب ہوا کہ ہمایوں کی صورت میں خود اس کی شباہت موجود ہے، تھوڑی دیر کے بعد ہمایوں سونے کے لئے چلا گیا، وہ جانے لگا تو پرویز نے اسے محبت سے لبریز آنکھوں سے دیکھا، شیریں نے بھی پرویز کی محبت بھری نظر دیکھی، اور اسے تعجب ہوا کہ پرویز سا خود غرض انسان بھی اتنی عظیم محبت کا حامل ہو سکتا ہے، تھوڑی دیر تک پرویز کھڑا ہوا، اس دروازے کو دیکھتا رہا

جس سے ہمایون باہر گیا تھا اس کی پیٹھ کھڑکیوں کی طرف تھی، ایک نامعلوم جذبے کے تحت شیریں نے موتیوں کا ڈبہ پرویز کے آگے پھینک دیا ڈبہ پرویز کی پیٹھ پر لگا اور گر پڑا، پرویز چونک اٹھا، مڑا تو ڈبہ نظر آیا، اسے اٹھا کر کھولا، کھولنے میں وہ پرچہ جس پر اس کے ہاتھ کی عبارت پہلے قلب سمندر سے، پھر میرے محبت بھرے قلب سے پیاری شیریں کے لئے) لکھی ہوئی تھی گرنے لگا، پرویز نے اسے پڑھا اور پڑھتے ہی پھر چونک پڑا، موتیوں کو غور سے دیکھا، چند لمحوں کے لئے واقعہ کی عجوبیت اور بے ساختگی کے سبب سے اس کے دماغ نے کام کرنا بند کر دیا، یہہ موقع شیریں کے لئے کافی تھا، خاموشی مگر تیزی سے وہ مکان کے باہر چلی گئی، پرویز کے حواس بجا ہوئے تو فوراً کھڑکی کے پاس آیا، وہاں تلاش کیا، پھر باہر نکل کر لان پر ڈھونڈا مگر کچھ پتہ نہ چلا، دل میں اُسے یقین تھا کہ دنیا میں صرف ایک ہستی ایسی ہے جو اس ڈبے کو اُس پر پھینک سکتی ہے، اس کا خیال آتے ہی شیریں کا مجسمہ اُس کے سامنے آگیا، بمشکل وہ کمرے تک پہونچا کمرے میں پہونچتے پہونچتے اس کا سر چکرایا، پانوں لڑکھڑانے لگے، ہمت کر کے میز کا خانہ کھول کر موتیوں کا ڈبہ رکھا، لیکن اب طاقت نے جواب دیدیا اور پرویز بیہوش ہو کر پڑا۔ دھماکے کی آواز سن کر ہمایوں نیچے آیا تو باپ کو بیہوش پایا، نوکر سب سو چکے تھے، بمشکل پرویز کو اٹھا کر کوچ پر لٹایا، اور ہوش میں لانے کی تدبیریں کیں، تھوڑی دیر میں پرویز کو ہوش آیا، بیٹے کے کندھے کا سہارا

لے کر سونے کے کمرے تک گیا، ہمایوں نے خواب آور دوا دی، اور پرویز سو گیا،

(۵)

صبح کو ناشتے کے بعد جہانگیر اور ہمایوں چہل قدمی کو نکلے، راستہ شیریں کے مکان کے سامنے سے تھا، وہ نقاب پہنے برآمدے میں ٹہل رہی تھی، ہمایوں نے جہانگیر سے پوچھا، "چچا جان یہ کون ہے"

جہانگیر نے جو کچھ پرویز کی زبان سے سنا تھا، بیان کر دیا، قصے کے اختتام تک ہمایوں کی آنکھیں بھی نم تھیں، واپسی میں اس کی نظر باغ کی زردہ حالت پر پڑی، اس نے جہانگیر سے کہا،

"چچا جان، اگر ہم اپنے مالی کو بھیج کر اس باغ کو درست کرا دیں تو کوئی ہرج ہے"

جہانگیر نے کچھ دیر غور کیا، پھر جواب دیا،

"جہاں تک مجھے اس کے واقعات زندگی کے علم سے اندازہ ہوا ہے وہ نہ اس کو پسند کرے گی نہ روا رکھے گی، ہاں یہ ممکن ہے کہ میں اور تم دونوں خود مل کر باغ کی درستی کر دیں، آج تعطیل کا دن ہے، مجھے فرصت بھی ہے،

ہمایوں فوراً راضی ہو گیا، مکان قریب ہی تھا، جا کر مالی کے ساتھ دو پھاوڑے اور کھرپے لے آیا، اور دونوں نے مل کر کام شروع کر دیا، شیریں ان لوگوں کو آتے دیکھ کر اندر چلی گئی تھی، جھلملیوں میں سے وہ ان دونوں کو کام کرتے دیکھتی رہی، ہمایوں اور جہانگیر نے خاردار درخت اور خود رو بیلیں

کاٹ کر نکال دیں، درختوں کے تھالے بنا دیئے، خوشرنگ بیلوں کو ترتیب دیدی، ایک بجا تو دونوں چچا بھتیجے پھاوڑے وہیں چھوڑ کر کھانا کھانے گئے، کھانے کے بعد ہمایوں تو پرویز کی طبیعت کی خرابی کے باعث ٹھہر گیا، جہانگیر پھر واپس آیا، باغ میں گھسا تو دیکھا کہ شیریں اس کے کام کا معائنہ کر رہی ہے، باغ نصف کے قریب درست ہو چکا تھا، نصف باقی تھا، شیریں سوچ رہی تھی کہ باغ کی موجودہ حالت خود اس کی زندگی کی داستان کی کس قدر اچھی تصویر ہے — ایک جانب نصف حصہ، اچھا، صاف ستھرا، آیندہ پھلنے پھولنے والا، درمیان میں ایک خط قائم، جو اس زمانے سے مشابہ تھا، جس میں اس پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹا، دوسری جانب پچیس برس کا کوڑا کرکٹ —— جہانگیر نے اس کے قریب پہنچکر کہا،

"کیا آپ سمجھتی تھیں کہ میں واپس نہ آؤں گا" شیریں چونک پڑی، وہ اپنے خیالات میں اس قدر محو تھی کہ اسے جہانگیر کے آنے کی خبر نہیں ہوئی، پلٹ کر اس نے جہانگیر کو دیکھا، جہانگیر نے کہا،

"میرا شعار یہ نہیں کہ کسی کام کو ہاتھ لگاؤں، اور ادھورا چھوڑ دوں، میں اپنے ساتھ کچھ بیج لیتا آیا ہوں، انھیں آپ کے باغ میں بودوں گا، تھوڑے دنوں میں درخت نکل آئیں گے، اور باغ کی خزاں کا اختتام ہو جائے گا۔"

"خزاں کا کبھی اختتام نہیں ہوتا" شیریں نے تلخی سے جواب دیا،

"میرا خیال تو یہ نہیں ہے، خزاں ایک خاص مدت سے زیادہ رہ ہی نہیں سکتی، ہمارے گرد و پیش اس کا ثبوت موجود ہے"

"ثبوت کہاں ہے، میں نے تو کبھی دیکھا نہیں" شعیرہ میں نے بھرآئی ہوئی آواز میں کہا،

"آپ نے نہیں دیکھا تو اس کا سبب یہ ہے کہ آپ نے دیکھنے کی کوشش نہیں کی، کیا آپ نے کبھی کوئی ایسا درخت دیکھا ہے، جو ہر بہار میں پھلتا پھولتا نہ ہو، بجز ان اشجار کے جو اپنی زندگی کے دن پورے کر چکے ہیں، ——— ایک پھول کھلتا ہے، بہار بھر شگفتہ رہتا ہے، پھر مرجھا کر سوکھ جاتا ہے گویا خواب میں ہے، لیکن کیا سال بھر کے بعد پھر اسی کونپل میں ویسا ہی پھول نہیں نکلتا ——— کلی سے کلی تک، پھول سے پھول تک، پھل سے پھل تک بہار سے بہار تک سال بھر سے زیادہ کا وقفہ نہیں ہوتا، حتیٰ کہ خزاں کی بہار کو بھی برسا دن سے زیادہ کا عرصہ نہیں لگتا، اس سے زیادہ وقفہ ہو نہیں سکتا، اس لئے کہ فطرت خوب سمجھتی اور جانتی ہے کہ ایک سلسلے میں ایک سال کا طویل غم بہت کافی ہے، اس سے زیادہ انسان کی برداشت سے باہر ہے"

"میں تو پچیس ۲۵ برس سے اپنے غم کا بار اپنے سینے پر لئے پھر رہی ہوں، اور آج تک خدا نے اسے ہلکا نہیں کیا"

"آپ اُسے ہلکا کر سکتی ہیں، بشرطیکہ آپ اُسے ہلکا کرنے کی کوشش کریں ——— دنیا کا سب حسن، تمام مسرتیں، ساری خوشیاں سمٹ کر شش کرنے

سے حاصل ہوتی ہیں۔ اور کوشش نام ہے کام کرنے کا، کام کئے جانے کا کام لینے
لئے اور دوسروں کے لئے کوئی شخص اس وقت تک سکون اور مسرت حاصل نہیں
کر سکتا، جب تک اس کے حصول کے لئے اس نے سعی نہ کی ہو، بہار کے موسم
میں تتلی کتنی خوش خوش، پھولوں کا منہ چومتی پھرتی ہے، اس کی ہستی مجسّم
مسرت اور اس کا وجود سراپا خوشی ہوتا ہے، لیکن اس کی تمام مسرت
اور اس کا سارا عیش ثمرہ ہے اس کی کوششوں اور کاوشوں کا، وہ پیدا ہونے
کے وقت سے بھوترے سے نکلنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتی ہے،
حتیٰ کہ بہار آنے تک وہ اس سے باہر نکل آتی ہے، اور اس طرح
پھولوں پر بیٹھ کر لطفِ بہار اٹھانے کے قابل ہوتی ہے"

بفرضِ محال، اگر کوشش کے باوجود وہ باہر نہ نکل سکے"

"یہ ممکن ہی نہیں، ہم ہر کام انجام دے سکتے ہیں، ہر منصوبے میں
کامیاب ہو سکتے ہیں، صرف کوشش شرط ہے، پتھر کے اندر بیج پہونچ
جاتا ہے، اس کے پر نہیں ہوتے کہ اُڑ جائے۔ بایں ہمہ وہ اسی پتھر میں پھوٹتا
اور پھیلتا ہے، یہاں تک کہ اسے توڑ کر باہر نکل آتا ہے، اور اسی پتھر سے اپنی
غذا حاصل کرتا ہے"

"لیکن انسان اور پرندوں اور جمادات میں بہت فرق ہے، ہم سب
ایک ہی مجموعۂ قوانین کے تحت زندگی بسر نہیں کرتے"

"کیوں نہیں، ایک ہی خدا نے سب کو بنایا ہے،

ہم سب سکون ابدی اور راحت سرمدی حاصل کر سکتے ہیں، ہم میں سے ہر ایک شانتی کے جام سے سیراب ہو سکتا ہے، بشرطیکہ ہم خلق کی خدمت کریں۔ خدا ہم پر مصیبت ڈالتا ہے، تاکہ دوسروں کی مصیبت کا احساس کر سکیں، ہم کو غم سے دوچار کرتا ہے، تاکہ دوسروں کے غم کا اندازہ کر سکیں، اور ان کی مصیبت اور غم میں ان کے شریک ہو کر ان سے ہمدردی کر سکیں،

شیریں کچھ دیر ساکت و خاموش رہی، پھر اُس نے کہا،

"آپ نے زنجیریں تو دیکھی ہوں گی، میں بھی پابہ زنجیر ہوں"

"ہاں"، جہانگیر نے کہا "میں نے زنجیریں دیکھی ہیں"، لیکن میرا عقیدہ ہے کہ زنجیریں ہم خود بناتے ہیں، ایام گزشتہ میں جب ایک شخص دوسرے کو قتل کر دیتا تھا تو قاتل کو مقتول کے ساتھ پابہ زنجیر کر دیتے تھے، اس طرح قاتل ہمیشہ اپنے گناہ کو اپنے ہمراہ لئے پھرتا تھا، یعنی جس وقت اس سے قتل کا ارتکاب ہوا اس نے اپنے پاؤں میں زنجیر ڈال لی"

"لیکن میں نے تو کوئی جرم نہیں کیا"

اسی سبب سے تو میرا خیال ہے کہ زنجیر کی کوئی کڑی کہیں نہ کہیں ڈھیلی ہے اور آپ تلاش کریں تو اس ڈھیلی کڑی کے ذریعہ سے آزادی حاصل کر سکتی ہیں"

"میں تو پچیس ۲۵ برس سے اس کڑی کی تلاش میں ہوں مگر مجھے اس کا پتہ نہیں ملتا" شیریں نے کہا،

"مجھے آپ کے حال پر افسوس ہے، لیکن باوجود تلاش کے کرڑی نہ ملنے کا سبب روشنی کا فقدان ہے، آپ ظلمت اور تاریکی میں مقیم ہیں ـــــ ابھی تک آپ کو سچی مسرت کا راز نہیں معلوم، جب آپ کی بد قسمتی کی شب تاریک ختم ہو کر طالع مسعود کا دن نکلے گا۔ اس وقت آپ اس کرڑی کو پا لینگی اور عیش دوام کا زینہ آپ کو مل جائے گا۔"

شیریں مکان کے اندر چلی گئی، جہانگیر کی گفتگو کا اس کی طبیعت پر بہت اثر پڑا، اور وہ دن بھر اسی پر غور کرتی رہی، ـــــ جہانگیر شام تک کام کرتا رہا، باغ صاف کر دیا بیج بو دیئے، اور کام ختم کر کے واپس چلا گیا، شیریں برابر اُسے جھلملیوں میں سے دیکھتی رہی، اس کے قلب کو جہانگیر کے دلائل کی صداقت کا احساس تھا، مگر وہ یہ جانتی تھی کہ وہ ایسی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے، جنہیں یا پرویز توڑ سکتا ہے یا موت،

ـــــ (۶) ـــــ

صبح کا وقت تھا، جہانگیر کو چند مسلیں دیکھنا تھیں، وہ ناشتہ کرتے ہی رخصت ہو گیا، پرویز، اور ہمایوں لائبریری میں بیٹھے رہے، پرویز اخبار دیکھ رہا تھا، اور ہمایوں ایک کتاب لئے بیٹھا تھا، دفعتاً ہمایوں نے سوال کیا،

"پاپا، شیریں سے آپ واقف ہیں؟"

پرویز کرسی پر سے اچھل پڑا، چہرے پر زبردستی سکون پیدا کیا،

پھر سنبھل کر بیٹھا اور کہا "کون شیریں ؟"

"یہ جو کھنڈر والے مکان میں رہتی ہے، اور جس کے چہرے پر ہمیشہ نقاب پڑی رہتی ہے"

"بیرسٹر صاحب کی لڑکی سے معلوم ہوتا ہے تمہارا مطلب ہے"

"اس کا پورا قصہ تو چچا جان مجھ سے بیان کر چکے ہیں، مگر میں اس کے علاوہ بھی اور کچھ واقعات معلوم کرنا چاہتا ہوں"

"جہانگیر نے جو کچھ تم سے بیان کیا، اس سے زیادہ مجھے معلوم نہیں"

ہمایوں خاموش ہو گیا، لیکن پرویز کے دماغ میں ایک طوفان اضطراب برپا ہو گیا، وہ سوچنے لگا کہ ہمایوں نے یہ سوال اس سے کیوں کیا، کیا کسی نے اسے اصلی واقعے سے مطلع کر دیا ہے یا شیریں نے اس سے تمام حالات بیان کئے ہیں ——— شیریں کا خیال آتے ہی اس کو اسی کا تصور بندھ گیا، گزشتہ چند دنوں میں اسے اس امر کا خوب اندازہ ہو گیا تھا کہ شیریں اب بھی اس کے دل اور دماغ پر قبضہ کئے ہوئے ہے، چھبیس برس تک وہ برابر خود کو یقین دلاتا رہا تھا کہ اب اس کی یاد باقی نہیں، بلکہ شیریں نہیں تو شیریں سے نامنصفانہ برتاؤ کی یاد ہمیشہ اسے ستاتی رہی، بظاہر وہ یہ کہہ کر اپنا دل خوش کر لیتا تھا کہ نہیں، اب وہ اسے بھلا دینے میں کامیاب ہو گیا ہے، اور اپنی اس کامیابی پر وہ نازاں ہوتا تھا، لیکن دل میں وہ خوب جانتا تھا کہ اس کی یہ کامیابی محض عارضی ہے اور موہوم

انسان ہمیشہ اسی قسم کی دل خوش کن کامیابیوں پر مغرور ہوتا ہے، اور اس وقت تک اپنی اس خام خیالی میں مست و سرشار رہتا ہے، جب تک مصیبت بالکل سر پر نہ آجائے، جب مصیبت آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے۔ اس وقت اس عارضی اور موہوم کامیابی کا پردۂ باطل رفتہ رفتہ آنکھوں سے اٹھتا ہے، اس کا بھی مگر یہ اثر نہیں ہوتا کہ وہ اس مصیبت سے نجات پا جائے، وہ مصیبت تو آتی ہے اور آکر رہتی ہے، انسان محض تھوڑی دیر کے لئے ہر چیز کا اصلی رنگ میں دیکھتا ہے، اگر یہ حالت باقی رہے تو اس سے پھر اسی قسم کی غلطی کا امکان نہیں مگر یہ تاثر بھی ہر چیز کی طرح عارضی اور موسوم ہوتا ہے، جب کچھ روز گزر جاتے ہیں تو پھر انسان کے لئے رہی ہیا آرزو اور وہی اس کی پر رونق کارگاہیں ہوتی ہیں ———— آدمی دریاؤں کو روکنے یا ان کے بہاؤ کے رخ کو بدلنے کی غرض سے ان پر بند تعمیر کرتا ہے اور اس طرح دریا کو مجبور کر دیتا ہے کہ اس کی مرضی کے مطابق چلے، یہ ظاہر دریا اس کے احکام کی تعمیل کرتا ہے، اور اتنی سہولت اور خاموشی سے کہ اسی سے انسان کو مشکوک ہو جانا چاہئے لیکن اس زعم کمال میں انسان درجہ مستغرق ہوتا ہے کہ اسے یہ آسانی اور سہل اقراری بھی شبہ میں نہیں ڈالتے۔ دن رات دریا کا پانی انسان کے بنائے ہوئے بند پر بوجھ ڈالتا رہتا ہے چھوٹے چھوٹے مگر تیز رو دہارے نیچے نیچے پوشیدگی سے بند کی بنیادوں کو کھوکھلا بناتے رہتے ہیں، حتی کہ ایک چھوٹا سا بالکل معمولی سوراخ پڑ جاتا ہے، دریا کے مخزن سے اور

تیز رو دھارے آکران چھوٹے تباہ کرنے والے دھاروں کی معاونت کرتے ہیں، فطرت بھی مسکراتی رہتی ہے، کیونکہ اسے تو انسان کا زعم باطل کرنے میں لطف آتا ہے، ــــــــ دفعتاً بند ٹوٹ جاتا ہے، اور دریا ہر اس شے کو جو اس کے راستے میں ہو بہالے جاتا ہے اور پیشتر سے دوچند سہ چند رفتار سے بہتا ہوا پھر اپنی پرانی آزادی حاصل کر لیتا ہے، بعینہٖ یہی حال انسان کا ہے، کوئی صدمہ ہو کسی قسم کا جذبہ ہو، اگر وہ سچا اور حقیقی ہے تو باوجود برسوں اور مدتوں کے جبر اور دبانے کے کبھی نہ کبھی قیود کی دیواروں کو توڑ کر سطح پر آجائے گا، ایک عرصے تک رکے رہنے کی سبب سے اس کی قوت مقابلہ اور بڑھ جاتی ہے اور سطح پر اس کا جوش اور اضطراب زیادہ شورش انگیز اور دیرپا ہوتا ہے، یہی حال پرویز کا تھا، ایک عرصے تک اس نے بہ ظاہر شیریں کے خیال کو دبائے رکھا تھا، لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ وہ کوشش کرے یا نہ کرے، یہ جذبہ زیادہ دنوں تک پوشیدہ رہنے والا نہیں، فرق اتنا تھا کہ پہلے اُسے اس کے انکشاف کی پروا نہ تھی، اب اُسے یہ فکر تھی کہ یہ راز طشت از بام ہوا تو ہمایون کو بھی اپنے باپ کی بزدلی اور کم ظرفی کی اطلاع ہو جائیگی، اور وہ بیٹا جو اپنے باپ کو شریف ترین آدمی اور حد سے زیادہ با عزت اور ایماندار انسان سمجھتا رہا ہے اپنے باپ کے اصلی صفات سے باخبر ہو کر اس سے متنفر ہو جائے گا، اس امر کا خیال آتے ہی اس کے جسم میں جھرجھری پیدا ہو گئی، دفعتاً اس کے کانوں میں جہانگیر کے یہ الفاظ گونجے

بیٹے

"اس کا اقرار آج تک باقی ہے، جو اسے اس پر مجبور کرتا ہے کہ یا اس اقرار کو پورا کرے یا اس سے نجات حاصل کرے" ـــــــ ان لفظوں سے اس کے دل و دماغ میں آگ سی لگ گئی، اسے ایسا معلوم ہوا جہانگیر کھڑا ہوا، اس کے سامنے کہہ رہا ہے اور وہ سن رہا ہے ـــ "کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ ایک انسان اتنے عظیم گناہ کا بوجھ اپنے سر پر لیے ہوئے خدا کے سامنے حاضر ہوگا ـــــــــ" قلبی اور ذہنی تلاطم سے گھبرا کر وہ اٹھ کھڑا ہوا، چہرے کا رنگ متغیر تھا، اُٹھتے ہی شیریں ـــــــ بیس سالہ حسین اور خوبصورت شیریں، ـــــــ کا چہرہ آنکھوں کے آگے آ گیا، شدت کرب میں اس نے آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا، لیکن اس چہرے کے نقوش آنکھوں کے سامنے سے زایل نہ ہوئے کمرے کی دیواریں اسے گھومتی ہوئی معلوم ہوئیں، کرسیاں اور میزیں رقص کرتی ہوئی دکھائی دیں اور پرویز بیہوش ہو کر گر پڑا ـــــــــ باپ کو اٹھتے دیکھ کر ہمایوں بھی کھڑا ہو گیا تھا، پرویز کے چہرے کو دیکھا تو اور بھی پریشان ہوا، آگے بڑھا کہ باپ کو سہارا دے، لیکن اتنی دیر میں پرویز گر پڑا، ہمایوں نے گھبرا کر نوکروں کو آواز دی، باپ کو اٹھا کر کوچ پر لٹایا، ہوش میں لانے کی تدابیر کیں، تھوڑی دیر میں پرویز کو ہوش آیا، ہمایوں نے پوچھا،

"بابا! طبیعت کیسی ہے،"

"اچھا ہوں" پرویز نے جواب دیا، لیکن جواب دیتے ہی اُسے پھر جہانگیر کے الفاظ یاد آئے۔ "اس کا اقرار آج تک باقی ہے، جو اُسے اِس پر مجبور کرتا ہے کہ یا اس قرار کو پورا کرے یا اس سے نجات حاصل کرے" یکایک اس کی روح کو مقید رکھنے والی زنجیریں ٹوٹ گئیں، احساسات کا طوفان، ضبط کے بندوں کو توڑ کر ہر قسم کی رکاوٹوں کو بہالے گیا، خودغرضی اور بزدلی کے الزامات جن سے اتنے دنوں تک وہ منکر رہا تھا اس کے دماغ پر بالکل ثبت ہو گئے، ـــــ اُسے اپنے جرم کا مکمل احساس ہوا، آنکھوں میں آنسو بھر آئے، ٹوٹتا ہوا اٹھا اور کمرے کے باہر چلا گیا، جسم کمزور تھا، اور روح احساس جرم سے زخمی، لیکن آخر کار انسانیت، صداقت اور حق نے فتح پائی تھی۔

(۷)

پرویز گھر سے نکلا تو سیدھا شیریں کے پاس پہونچا، دروازہ کھلا اور شیریں اندر تھی، اس کے رنج و غم میں اب سکون کی جھلک تھی، اطمینان تھا کہ جو کچھ ہونے والا تھا ہو چکا، اب محض اس کی یاد اور یاد کی برداشت باقی ہے، ـــــ پرویز لڑکھڑاتا ہوا داخل ہوا تو شیریں کھڑی ہو گئی ـــــ

"شیریں" پرویز نے کہا "شیریں، میں یہ اقرار کرنے آیا ہوں کہ میں نہایت بزدل اور خودغرض ہوں"

شیریں ہنسی، ایک تلخ اور زہر خند قہقہہ، جس سے پرویز پر ایک عجیب

کیفیت طاری ہوگئی۔

"میں یہہ پہلے ہی سے جانتی تھی' آپ کو صرف یہ کہنے کی خاطر مجھ تک آنے کی زحمت گوارا کرنے کی ضرورت نہ تھی"

"شیریں" پرویز نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "شیریں پچیس۲۵ برس گذرے جب میں نے تم سے شادی کی درخواست کی تھی' تم نے اسکو منظور کر لیا تھا' آج تک میں اپنے اقرار کی زنجیروں میں مقید ہوں' میں نے ان سے آزاد ہونے کی خواہش کا اظہار نہیں کیا بلکہ ایک کتے کی طرح منہ چھپا کر تم کو چھوڑ کر چلا گیا' میں آج اس لئے آیا ہوں کہ تم سے کہوں میں اپنا اقرار پورا کرنے کو تیار ہوں" ــــــ

"پچیس برس گذرے" شیریں نے کہا "جب تم نے مجھ سے شادی کی درخواست کی تھی' تم آج تک اس اقرار کی زنجیروں میں بندھے ہوئے ہو' آج میں تمہیں آزاد کرتی ہوں"

"نہیں نہیں" پرویز نے کرب سے کہا' "نہیں' میں آج اسے پورا کرنے آیا ہوں اس سے آزاد ہونے نہیں"

"کیوں" شیریں کا یہ ایک لفظ' پرویز کے دل میں تیر کی طرح اتر گیا'

"تا کہ اپنے گزشتہ برتاؤ کی تلافی کروں"

"کیا اسی کو تم تلافی کہتے ہو' پچیس۲۵ برس گذرے جب میں نے تمہیں

موت نہیں، موت سے بدتر شئے سے بچایا، مجھے تم سے محبت تھی، اسی محبت کی خاطر میں نے اپنی خوبصورتی، اپنی جان، تمھارے لئے خطرے میں ڈالی اور تم نے مجھے اس کا بدلہ کیا دیا، میرے صحت پانے تک بھی تم نہ ٹھہرے، میرا شکریہ ادا کرنے کا بھی تم کو خیال نہیں آیا، تم مجھے اس وقت چھوڑ کر چلے گئے جب ہمدردی اور اعانت کی مجھ کو سخت ضرورت تھی، اور اس صدمے نے میری ماں کا دل توڑ دیا، جس سے وہ مر گئی اور میرے بال سفید کر دیئے، جس سے میں مُردوں سے بدتر ہو گئی، تم یہ سمجھ کر کہ میں جلنے سے بدصورت ہو گئی ہوں، مجھ سے چھپ کر روپوش ہو گئے۔"

"میں نے سمجھا نہیں، خود جا کر دیکھا"

"لیکن اس صورت میں بھی تمھارا طرزِ عمل قابلِ نفرت تھا، تم نے اتنی وحشیانہ اور تہذیب سوز حرکت کی کہ اس کا انتقام بجز خدا کے کوئی اور تم سے نہیں لے سکتا۔ یہی نہیں بلکہ تمام جرم اس سے زیادہ سنگین ہے، جتنا تم سمجھتے ہو، ــــ لو، دیکھو اس عورت کی صورت دیکھو، جو تم کو موت سے بچانے کے لئے بھی اب تم سے شادی نہ کرے گی"

یہ کہہ کر شیریں نے نقاب الٹ دی،

پرویز کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا آگیا، لڑکھڑا کر وہ پیچھے ہٹا، حیرانی اور تعجب نے اس کے قدم پکڑ لئے، کچھ دیر ساکت کھڑا رہا، پھر آہستہ آہستہ آگے بڑھا، شیریں کا ہاتھ اٹھا کر اس کی انگلیوں کو اپنے لبوں سے لگایا ــــ

شیریں پھر ہنسی، وہی تلخ زہر قند ہلکا سا قہقہہ، اور کہا۔
"ہاں اس ہاتھ کو بوسہ دو، کیونکہ یہ ان حصوں میں نہیں ہے جو جل گئے تھے"

(۸)

دل شکستہ اور اپنی بزدلی کا داغ بدستور اپنے دل پر لئے پرویز گھر واپس آیا، ہمایوں کسی مریض کو دیکھنے گیا ہوا تھا، پرویز لائبریری میں پہنچا، اور میز کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا، سر ہاتھوں سے تھام لیا، اور اپنی گذشتہ زندگی پر تنقید کرنے لگا، شیریں کا چہرہ برابر اس کے سامنے تھا، کوشش کی کہ سامنے سے ہٹ جائے، مگر کامیاب نہ ہوا، انتہائے اضطراب میں آنکھیں بند کریں، سوچنے لگا کہ اگر میں اس چہرے تک پہنچ جاؤں تو اس کا گلا گھونٹ ڈالوں، ____ لیکن اس خیال کے ساتھ ہی قوت ارادی نے تمام دوسرے خیالات پر غلبہ پا لیا، آواز بلند کہنے لگا "میں اپنے دوسرے گناہوں میں قتل کا گناہ شامل کرنا نہیں چاہتا ____" قتل کا گمان گزرتے ہی پرویز کے تخیل کا رخ بدل گیا، دل میں سوچنے لگا "میں مر جاؤں گا تو شیریں کا چہرہ اس وقت بھی میرا پیچھا نہ چھوڑے گا، کیا جب میرا شمار ارواح میں ہوگا، اس وقت بھی یہ شکل مجھے چین نہ لینے دے گی، اس وقت بھی یہ سحر آگین آنکھیں مجھے دیکھتی رہیں گی، زندگی میں تو وہ اور میں جدا نہیں ہو سکتے، کیا موت کے بعد بھی وہ میرا پیچھا نہ چھوڑے گی" پرویز کی

محویت کا یہ عالم ہوا کہ دوپہر گذری، سہ پہر ہوگئی، اور اُسے خبر نہ ہوئی،
دن ختم ہوکر شام آئی رات کے آثار نمایاں ہو چلے، کمرے میں تاریکی ہوگئی،
مگر وہ یُونہی بیٹھا رہا، حتیٰ کہ ہمایوں واپس آیا، اسی نے روشنی کی، کھڑکیاں
کھولیں پھر باپ کے پاس آکر بیٹھ گیا، اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے
کر کہنے لگا ۔

"پاپا، میں جانتا ہوں آپ سے زیادہ شریف خیال، حق پرست
اور ایمان دار انسان دنیا میں بہ مشکل ملے گا آپ ہمیشہ وہی کرتے ہیں جو
حق ہوتا ہے، وہی کہتے ہیں جو صداقت ہوتی ہے، میں آپ کی صبح کی بیہوشی
کا سبب خوب سمجھتا ہوں، میں نے آپ سے شیریں کے متعلق سوال کئے،
اُن سوالات سے آپ کا ذہن، اس کی عبرتناک داستانِ حیات کی طرف
منتقل ہوگیا، اور آپ کو اپنے اور اس کے زمانہ طالب علمی کی یاد آگئی،
کام آپ ویسے ہی زیادہ کرتے ہیں، دماغ اس کشاکش کو برداشت نہ کرسکا
_____ اب میں آیندہ سے کبھی اُس کا ذکر آپ کے سامنے نہ کروں
گا، البتہ اتنا اور کہنا چاہتا ہوں کہ آج میں نے اس کی صورت دیکھی"

پرویز کرسی پر سے اچھل پڑا، شیریں کا چہرہ، جو اب مستقلاً اس کے
سامنے رہتا تھا، اس کے اور قریب آگیا ۔

"کیا اُس نے اپنی صورت خود تمھیں دکھائی" پرویز نے کانپتی ہوئی آواز
سے پوچھا،

"جی نہیں، میں نے اتفاق سے اس کی صورت دیکھ لی، میں آج اس کے پاس گیا تھا، دروازہ کھلا ہوا تھا، میں بے تکلف اندر چلا گیا، وہ سو رہی تھی، نقاب الٹے ——— پایا، وہ بہت حسین ہے، اتنی حسین کہ اس سے بڑھ کر خوبصورت عورت میں نے کبھی نہیں دیکھی، اس کا بُشرہ مکمل ہے، جیسے سنگِ مرمر سے تراشا گیا ہو، اس کی آنکھیں اتنی خوشنما ہیں کہ وہم و گمان میں بھی اتنی خوشنمائی نہیں آسکتی، البتہ بال اس کے بالکل سفید ہیں، لیکن ان کی سفیدی میں بھی سیاہی سے زیادہ خوبصورتی ہے، باوجود اس کے وہ نقاب پہنتی ہے"

"پھر تم نے اس سے اس کا سبب دریافت نہیں کیا" پرویز نے کہا۔

"ہاں، میں نے دریافت کیا اور اس نے تفصیل سے سب باتیں مجھے بتلائیں ——— میں نے خوشامد کی اس سے التجا کی کہ وہ مجھے اس شخص کا پتہ بتادے جو اس کی تباہ حالی کا ذمہ دار ہے، لیکن اس نے نہ بتایا"

پرویز کے دل کی حرکت تیز ہوگئی، خون دماغ کی طرف منتقل ہونے لگا، ہمایوں کی گفتگو کے دوران میں اس کی حالت ایک ایسے شخص کی مانند تھی، جس کے سر پر ایک برہنہ دودھاری تلوار لٹک رہی ہو، جس کا گرنا بدیہی اور لازمی ہو، وہ خواہ کسی رخ سے گرے، زخمی ضرور کرے گی، ———

"اس نے مجھے اپنے چہرے کے نہ جلنے کی وجہ بھی سمجھائی کہ جس وقت دھماکہ ہوا اس نے فطرتاً اپنا بازو چہرے پر رکھ لیا، جس سے چہرہ جلنے سے بچ گیا، مگر شانے اور ہاتھ پر بہت زخم آئے ——— صحت پانے پر جب اسے

اس کا علم ہوا کہ اس کا منگیتر ایک غلط فہمی میں مبتلا ہو کر مفقود الخبر ہو گیا تو اسے بہت صدمہ ہوا۔ اس پر طرہ ماں کی موت اور بیکسی، اس ہجوم غم نے اس کے بال سفید کر دیئے ——— میں نے دوبارہ اس سے التجا کی وہ مجھے اپنے منگیتر کا نام و نشان بتا دے مگر اس نے صرف اتنا کہا کہ وہ اب بھی بقید حیات ہے اور خوش و خرم، اس کو اپنی حیوانیت اور بزدلی کی کوئی سزا نہیں ملی ہے ——— پاپا، انسان کا فرض ہے اور انسانیت اس کی طلبگار ہے کہ اس شخص کو سزا دی جائے، مجھے اگر وہ شخص کسی طرح مل جائے تو میں اپنے ہاتھ سے اس کی دھجیاں اڑا دوں"

پرویز کیا، ہر ذی روح کے لئے برداشت کی ایک حد ہوتی ہے ——— لڑکھڑاتا ہوا وہ کرسی سے اٹھا، دفعتاً شیریں کا چہرہ اس کے سامنے سے غائب ہو گیا، اندھوں کی شکل ہاتھوں سے ٹٹولتا ہوا وہ ہمایوں کے قریب گیا اور آنا وانہ بلند کہا۔ "ہمایوں اٹھو، وہ کمبخت تمہارے سامنے موجود ہے، اٹھو اور اس کی دھجیاں اڑا دو"

پرویز کی حالت دیکھ کر ہمایوں کھڑا ہو گیا۔ ایک لمحے تک وہ بالکل خاموش رہا۔ اس کو یقین نہ آیا کہ جو کچھ پرویز کہہ رہا ہے وہ صحیح ہے لیکن رفتہ رفتہ اُسے خیال ہوا کہ جو کچھ وہ بیان کر رہا ہے وہ یقیناً درست ہے، اسے تعجب ہوا کہ وہ اب تک اس راز کی تہہ تک کیوں نہیں پہونچا تھا۔

"پاپا، پاپا" اس نے روتے ہوئے کہا، "نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا"
پرویز نے ہمایوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالدیں، شیریں کا چہرہ اب

اس کے سامنے نہ تھا، لیکن اب اس سے زیادہ تکلیف دینے والی ایک اور شئے تھی، بہ غور اس نے ہمایوں کے چہرے کو دیکھا، ـــــ بے اعتباری تعجب اور خوف نے رفتہ رفتہ یقین کے جذبے کو جگہ دی، اس کے بعد نفرت کا اظہار ہوا، اور نفرت بھی اتنی مکمل اور عمیق جس کی کوئی داد فریاد نہیں ـــــ اپنی روح کی تمام گہرائیوں کے ساتھ ہمایوں پرویز سے نفرت کرنے لگا، اور پرویز کو اس کا اندازہ ہوگیا،

"پاپا، پاپا" ہمایوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ "للہ مجھ سے کہہ دیجئے کہ یہ سچ نہیں ہے، صرف ایک لفظ کہہ دیجئے" اور میں یقین کروں گا"

پرویز کا سر نیچا ہو گیا، اس کی آنکھیں جھک گئیں، چہرے پر پسینہ آگیا، اس نے دونوں ہاتھ بڑھائے کہ ہمایوں کو چھوئے، ہمایوں پیچھے ہٹ گیا جیسے کوئی کسی زہریلے ناگ کی دسترس سے باہر ہونے کی کوشش کرتا ہو، پرویز نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے باہر چلا گیا، ـــــ ہمایوں کی ٹانگیں جواب دینے لگیں، کرسی کا سہارا لے کر بیٹھ گیا، غم اور غصے کے مارے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں،

"پاپا، پاپا" اس نے چپکے سے کہا "پاپا، پاپا" ـــ

کمرے کے باہر پرویز شرابیوں کی طرح جھومتا ہو ازینے پر چڑھ رہا تھا،

آگے آگے اُس کے شیریں کی تصویر بھی سیڑھیوں پر چڑھ رہی تھی۔ اُسے خیال آیا اُس نے ایک بار ایک مریض سے کہا تھا کہ "انسانی تکالیف کی ایک حد ہوتی ہے جس کے آگے نہ وہ جا سکتی ہیں نہ لے جائی جا سکتی ہیں" اب اُس نے محسوس کیا کہ اس کا یہ خیال غلط تھا، ہمایوں سے اُسے بے حد محبت تھی، اُس کی نفرت نے اس کا دل توڑ دیا، وہ ہر قسم کی جسمانی اذیت برداشت کرنے کو تیار تھا، مگر ہمایوں کی جانب سے نفرت کا اظہار اس کی روح کے لئے تکلیف دہ تھا،

ــــــ شیریں کی تصویر اب بھی آگے آگے چل رہی تھی، مگر اب وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے لئے شیریں پر وہی شیریں ہو گئی ہے، جو پچیس برس پہلے تھی، ــــــ اب تک پرویز نے کبھی موت کی خواہش نہیں کی تھی، اس کے نزدیک موت ــــ فضول چیز تھی، جیسے بغیر کسی سبب کے چلتی ہوئی گھڑی کو روک دیا جائے، مگر اب وہ خود موت کا آرزومند تھا، اب اس کے نزدیک موت ایک بہت دلچسپ چیز تھی، سب سے بڑی راحت تمام تکلیفوں کی خاتم، تمام صدموں کا علاج، اُسے خیال آیا، اگر میں مر جاؤں تو پھر ہمایوں مجھ کو کراہت اور نفرت کی نظر سے نہ دیکھے گا، نہ شیریں کا چہرہ اس کے سامنے آ کر دل پر چرکے دے گا، دفعتاً اس کی ذہنیت میں عظیم تبدیلی ہوئی، اس نے سوچا " وہ عورت جس سے مجھے محبت ہے میرے سامنے ہے، وہ لڑکا جس کو میں اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں نیچے موجود ہے! اور ہر طرح کے آرام و آسائش کے سامان اُسے مہیا ہیں، اس سے زیادہ

یا انسان مانگ سکتا ہے" یہ سوچ کر وہ مسکرایا اور جواب میں شیریں کا چہرہ بھی مسکراتا ہوا نظر آیا، خواب گاہ میں پہونچ کر ایک زہر قاتل کی شیشی اس نے ی، تھوڑا سا زہر ایک گلاس پانی میں گھولا اور کہا۔

"شیریں، میں تمھیں گواہ کرتا ہوں، اس بات کا کہ میں اپنے اعمال ور اپنی غلطیوں کا کفارہ ادا کر رہا ہوں اور اس منصف حقیقی کے سامنے جا رہا ہوں جو بڑے سے بڑے اور چھوٹے سے چھوٹے مقدمے کا فیصلہ نہایت منصفانہ طریقے سے کرتا ہے، سب سے بڑا منتقم حقیقی ہے اور سب سے بڑا ارحم الراحمین"

پرویز کو ایسا معلوم ہوا کہ وہ لاجواب آنکھیں آنسوؤں سے ڈبڈبا آئیں لر وہ سرخ سرخ لب مسکراتے ہی رہے، اس نے زہر پی لیا، کمرے میں اندھیرا تھا، وہ لیٹ گیا،

"شیریں" اس نے پکارا "شیریں، آؤ، اور میرے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دو"

شیریں کی تصویر آگے بڑھی، اور اس کی پٹی کے پاس دو زانو بیٹھ گئی، پرویز نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہا لیکن نہ لے سکا، اس نے محسوس کیا س کا سر جھک رہا ہے۔ اس جگہ کی طرف جو مرد کی پہلی اور آخری آرامگاہ ہے ــــــــ عورت کا سینہ ــــــــ اور تھوڑی دیر میں پرویز مر گیا۔

۹

ہمایون کو شب بھر نیند نہ آئی، غم و اندوہ، کرب اور بے چینی نے اس کا یہ حال کیا کہ ایک منٹ کو پلک نہ جھپکی، گناہ باپ سے سرزد ہوا تھا، اور بار بیٹے کے کندھے محسوس کر رہے تھے، لیکن چارہ کچھ نہ تھا، جو شخص ملجرم تھا وہ اس کا باپ تھا، اور اس کی رسائی سے باہر، اس نے تہیہ کر لیا کہ صبح ہونے ہی باپ سے علیحدہ رہنے کی تدبیر کرے گا، اس کا ارادہ تھا، دنیا کو اس کا علم نہ ہونے پائے کہ باپ بیٹوں کے تعلقات میں پیشتر کی نسبت کسی قسم کا فرق ہے، اگر اپنی جگہ پر وہ اُس سے بے انتہا نفرت کرنے لگا تھا اُسے یقین تھا کہ پرویز کی زندگی تک یہ نفرت یقیناً باقی رہے گی ———

دل ہی دل میں وہ اس کا تہیہ کر رہا تھا اس نفرت کا علم کسی اور کو نہ ہونے دے نہ پرویز کو، اسے کیا معلوم تھا کہ رات ہی کو پرویز کو اس کا احساس ہو گیا تھا کہ اس کا بیٹا جو اسی کا گوشت پوست ہے اُس سے بھاگتا اور اس سے نفرت کرتا ہے، اب ہمایوں کی سمجھ میں آیا کہ شیریں نے اسے اپنے منگیتر کا نام اور پتہ بتانے سے کیوں انکار کیا تھا، اور اس علم سے اس کی قدر و منزلت اس کے دل میں زیادہ ہو گئی، صبح کو مقررہ وقت پر وہ لائبریری میں آیا، اور یہ دیکھ کر کہ پرویز ابھی نیچے نہیں اترا ہے، اس نے اخبار اٹھا لیا اور اسے دیکھنے لگا، بہ ظاہر نظریں اخبار پر تھیں، لیکن دل و دماغ کہیں اور تھے، نوکر نے ناشتہ لا کر رکھ دیا اور چلا گیا، ہمایون کو انتظار کرتے کرتے نو بج گئے

اور پرویز نہیں آیا تو نوکر نے ڈرتے ڈرتے ہمایوں سے کہا۔

"میاں، آج ڈاکٹر صاحب ابھی تک نہیں اترے"

"ہاں شاید وہ غضب کر ویر میں سوئے، اب آتے ہی ہوں گے"

"مگر میاں، اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا، آپ جا کر دیکھ آئیے ممکن ہے ان کی طبیعت کچھ خراب ہو"

مڑ گیا وکر ہا ہمایوں اوپر گیا، جب دروازے کو دھب دھبانے سے کوئی جواب نہیں ملا تو وہ اندر داخل ہوا، پرویز بستر پر لیٹا ہوا تھا، پورے لباس میں، چہرے پر سکون و راحت کا تبسم تھا، ہمایوں قریب گیا، باپ کا شانہ ہلایا، پھر نبض دیکھی، دل دیکھا، کہیں کوئی حرکت نہیں تھی، سامنے ہوئے ہاتھوں سے اس نے پرویز کی بند آنکھوں کے پپوٹے کھول کر دیکھے، انہیں دیکھ کر وہ سب کچھ سمجھ گیا، ادھر ادھر نظر ڈالی تو گلاس پر پڑی، اسے اٹھا کر سونگھا، حمام میں جا کر اسے خوب دھویا، اور الگ رکھدیا، خود نیچے اتر کر نوکروں کو اطلاع کی اور پرویز کے سرہانے بیٹھ گیا اس کا ابتدائی جذبہ اطمینان و سکون کا تھا، اس نے محسوس کیا کہ پرویز نے مناسب ترین طریقہ اختیار کیا خود نجات پانے کا اور اس کو نجات دلانے کا۔

دل ہی دل میں اس نے پرویز کی قدر کی اور اس کا شکریہ ادا کیا اسنے اسکو قعر ذلت سے بچا لیا۔

لیکن رفتہ رفتہ اسے خیال ہوا کہ موت سے باپ مر گیا، مگر داغ رسوائی نہیں مٹا، اس میں شک نہیں کہ جو تکلیف سے باپ کو زندہ دیکھکر ہوتی وہ اب نہ ہوگی لیکن کیا بزدلی اور بے غیرتی کی یاد کو بھی وہ بھلا سکے گا، اس جذبہ کے بعد سے اس محبت کا احساس ہوا جو پرویز کو اس سے تھی اور اس

خیال کے ساتھ ہی آنسوؤں کا دروازہ جو اب تک بند تھا کھل گیا، اور وہ رونے لگا، کچھ دل ہلکا ہوا تو اسے اس کا ادراک ہوا کہ وہ اس وقت دنیا میں یکہ و تنہا ہے، جہانگیر کسی قانونی غرض سے باہر گیا ہوا تھا، اور کوئی ایسا تھا نہیں جو اس کی مدد کرتا، یا اس ہمدردی سے کرتا، معاً اُسے خیال آیا کہ شیریں سے بڑھ کر کون پرویز کا شناسا ہو سکتا ہے، یہ سوچتے ہی وہ اٹھا اور گرتا پڑتا شیریں کے یہاں پہونچا، سہ پہر کا وقت ہو چکا تھا، شیریں باغ میں تھی، ہمایون نے بھرآئی ہوئی آواز سے کہا،

"میرے باپ کا انتقال ہو گیا، اور اپنی موت کا ذریعہ وہ خود تھے"

شیریں چونک پڑی،

"مجھے بہت رنج ہے اور تمھارے ساتھ ہمدردی ہے"

"آپ کو رنج ہونے اور ہمدردی کرنے کی کوئی وجہ نہیں، یہ فرض تو میرے باپ کا تھا اور اب میرا ہے"

شیریں پھر چونک پڑی، اس نے سمجھ لیا، "معلوم ہوتا ہے پرویز نے موت سے پیشتر سب حال ہمایوں کو بتایا تھا۔

"میں اس لئے آیا ہوں" ہمایون نے خفیف سی خاموشی اور ہچکچاہٹ کے بعد کہا "کہ آپ سے درخواست کروں، میرے مرے ہوئے باپ کو معاف کر دیجئے"

"لیکن انھوں نے خود کبھی معافی کی خواہش نہیں کی" شیریں نے

تھوڑی سی خاموشی کے بعد جواب دیا"

"میں جانتا ہوں، لیکن میں آپ سے اس کی خواہش کر رہا ہوں، پرویز کا لڑکا آپ سے اس کی التجا کرتا ہے کہ اپنی گزشتہ محبت کے صدقے میں پرویز کو معاف کر دیجئے، اور اسے اپنے خالق کے حضور میں گنہگار نہ جانے دیجئے"

"لیکن انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی اس کی خواہش نہیں کی" شیریں نے پھر ذرا درشتگی سے جواب دیا

"اسی لئے تو انھیں معاف کرنے کی اور زیادہ ضرورت ہے، علاوہ بریں اسی پر میری زندگی کا دار و مدار ہے، آپ یقین کیجیے کہ جب تک آپ انھیں معاف نہیں کریں گی، میں کسی ذی روح سے آنکھ ملا کر بات نہ کر سکوں گا،

——— آئیے، آئیے، میرے ساتھ آئیے، میرے ہمراہ چلئے، میں جانتا ہوں کہ جو کچھ میں آپ سے چاہتا ہوں اس کا کرنا آپ پر گراں ہوگا، لیکن میری خاطر انھیں معاف کر دیجئے، آپ سوچئے، اگر ان سے یہ گناہ سرزد نہ ہوا ہوتا تو آج آپ میری ماں ہوتیں، اسی لئے میں نے خود بھی انھیں ابھی تک معاف نہیں کیا ہے، لیکن میں جانتا ہوں کہ مجھے بھی معاف کرنا ہوگا اور آپ کو بھی"۔

یہ کہہ کر ہمایوں نے شیریں کا ہاتھ پکڑا اور اپنے گھر لے آیا، پرویز کی نعش ابھی تک اس کی خوابگاہ میں تھی، ہمایوں شیریں کو سیدھا وہیں لے گیا،

شام ہوچلی تھی، ہمایوں نے روشنی کی اور کمرے کا دروازہ اندر سے بند کرلیا،

"یہہ اُن کی نعش ہے، خود تو وہ چلے گئے مگر میرے لئے ذلّت اور بے غیرتی کی گٹھری چھوڑ گئے، انھیں معاف کر دیجئے، خدا کے واسطے انھیں معاف کر دیجئے" ۳۱-۱۰-۹۱

شیریں نے آہِ سرد بھری، وہ پرویز کے بالکل قریب کھڑی تھی، اتنے قریب کہ اس کا دامن پرویز کے جسم سے مس ہو رہا تھا، لیکن اب اس کے دل میں پرویز کی جانب سے کوئی خطرا تھا نہ کوئی عناد، پرویز اب وہی پرویز تھا، جس سے کسی زمانے میں اسے عشق تھا، جس کے آغوش میں بیٹھ کر اس نے گھنٹوں باغوں اور چاندنی راتوں کی بہاریں دیکھی تھیں، جس کے گلے میں بانہیں ڈال کر وہ سیکڑوں خواہشیں کیا کرتی تھی، اب اُسے محسوس ہوا کہ موت سب مرضوں کی دوا ہے، ——— سب معموں کا حل، ——— ہمایون آہستہ سے باہر نکل آیا، اور شیریں اور پرویز پھر ایک بار ایک دوسرے کے ساتھ تنہا رہ گئے،

شیریں نے نقاب الٹ دی، روشنی پرویز کے چہرے پر پڑ رہی تھی، ایک ایک سطر خوب روشن اور عیاں تھی، موت پرویز کے لئے بہت مہربان ثابت ہوئی تھی، آنکھیں بند تھیں، دہانے کے دونوں جانب وہ لکیریں جو ظلم اور خودغرضی کی نشانی تھیں محو ہو چکی تھیں، چہرے کی سختی نرمی اور سکون سے بدل گئی تھی، ہونٹوں پر ہی وہ دلکش مسکراہٹ تھی جو شیریں نے پچیس برس پہلے تمام محبت میں پایا

دیکھی تھی، اب پرویز پھر ایک بار وہی پرویز تھا، جو شیریں کے ساتھ ایک ہی جماعت میں تعلیم پاتا تھا، جس کے ساتھ وہ تجربہ گاہ میں کام کیا کرتی تھی، ــــــــ

شیریں نے پھر بغور پرویز کے چہرے کو دیکھا، معاً اس کے ذہن میں خیال آیا کہ "جن سے ہمیں محبت ہوتی ہے انھیں پر ہم زیادہ ظلم کرتے ہیں" ــــــــ

"اے خدا، اے یزداں" اس نے با آواز بلند کہا "میری مدد کر، مجھے استقلال دے، مجھ کو ظرف عطا کر کہ میں اُسے معاف کر سکوں"۔

دفعتاً اسے جہانگیر کے الفاظ یاد آئے ــــــــ "خدا ہم پر مصیبت ڈالتا ہے کہ ہم دوسروں کی مصیبت کا احساس کر سکیں، اور دوسروں کی مصیبت و غم میں شریک ہو کر ان سے ہمدردی کر سکیں"

پھر اس نے پرویز کے چہرے کی طرف دیکھا، اور اب اُسے اندازہ ہوا کہ پرویز کے چہرے میں بہ نسبت گذشتہ دن کے جب وہ اُس سے ملنے گیا تھا بہت تغیر ہو گیا ہے، اسے خیال آیا کہ یقیناً ان چوبیس ۲۴ گھنٹوں میں اس کو اپنے افعال گذشتہ پر بہت شدید پشیمانی ہوئی،

"اے میرے مالک" اس نے دونوں ہاتھ جوڑ کر، پرویز کی پیٹی کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کہا "مدد کر میری اس کو معاف کرنے میں" ــــــــ

یکایک اس کے دل میں رحم کی لہریں موجزن ہوئیں، جھک کر اس نے پرویز کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور پرویز کے مُردہ چہرے سے یہ آنسوؤں کی بارش ہونے

—— (۱۰) ——

شیریں باہر نکلی تو رات ہو چکی تھی، اس نے جہانگیر کو ہمایوں کے پاس بیٹھے پایا، وہ بھی وہیں جا کر بیٹھ گئی، اُس کے قلب کو ایک عجیب سکون حاصل تھا، اس کے سینے میں ایک انوکھی راحت تھی، جیسے اس کی تمام تکلیف، اُس کے تمام مصائب کا خاتمہ ہو گیا ہو، جہانگیر ہمایوں کو سمجھا رہا تھا :

"ہمایوں، زندگی کے لئے موت ضروری ہے اور لازمی، ہم کو اس کا علم نہیں کہ موت کے بعد کیا ہوتا ہے لیکن یہ ایک پردہ ہے جو ہمیشہ انسانی آنکھوں کے سامنے پڑا رہتا ہے اور صرف چند لمحوں کے لئے موت کے وقت اٹھتا ہے —— زندگی ایک قوس قزح ہے جو دو عظیم خاموشیوں، دو بڑے سکوتوں کو ملاتی ہے۔ آفرینش سے پہلے کی خاموشی اور موت کے بعد کا سکوت —— یہ ایک سیڑھی ہے، دونوں کے درمیان، اور اس لئے انسان کا اختتام، اس کے آغاز سے زیادہ تعجب انگیز نہیں، وہ خدا جس نے زندگی میں ہمارا خیال رکھا، وہی خدا مرنے کے بعد ہماری دستگیری کرے گا تمھارے باپ میرے حقیقی بھائی تھے، اور ایسے بھائی جن کی مثال مشکل سے ملیگی، ان کا ورقِ حیات پاک و صاف ہے اور بے داغ، ایک دھبہ بھی بزدلی یا بے غیرتی کا اس پر نہیں" —— (اس موقعہ پر ہمایوں نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا مگر شیریں اسی طرح بیٹھی رہی) ——

"وہ بہادر تھے" جہانگیر نے سلسلہ کلام جاری رکھا،

"زندگی کے میدانِ جنگ کے ایک نڈر اور دلیر سپاہی، جو دشمن انکے سامنے آیا، جس غنیم نے حملہ کیا، انھوں نے مردانہ وار اس کا مقابلہ کیا ——— بزدلی کے نام سے وہ نا آشنا تھے، ہر فرض کو انھوں نے مردانگی سے انجام دیا، ان کے پہلو میں عالی ظرف دل تھا ——— یہ دنیا جنت ہو جائے، اگر ان کے سے دو چار آدمی دنیا میں ہوں، ان کی مثال سے ہم کو سبق لینا چاہیئے ——— ہمایوں تم خود اندازہ کر سکتے ہو کہ مجھ کو ان کی موت کا کتنا صدمہ ہے، لیکن جب تک ہم کو خود غموں سے سابقہ نہیں پڑتا، ہم دوسروں کے غموں کو محسوس نہیں کر سکتے، اپنی کمزوریاں دیکھ کر ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ دوسروں کے عیوب سے کس طرح چشم پوشی کرنی چاہیئے ——— آج انھوں نے دنیا کو خیرباد کہہ دیا، اب وہ ایک سکوتِ عظیم میں سونے جا رہے ہیں اور وہاں اُس وقت تک سوتے رہیں گے جب تک قیامت نہ آئے، اور خدا اپنے طلسم پنہاں کو نہ توڑ دے" ——— جہانگیر کی آواز بھرا گئی، سلسلہ ٹوٹ گیا، اور انتہائے غم میں وہ اُٹھ کر باہر چلا گیا ———

ہمایون نے شیریں سے پوچھا "آپ نے انھیں معاف کر دیا" شیریں نے منہ سے جواب نہیں دیا، اثبات میں سر ہلا دیا، اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے ———

"اماں" ہمایون نے کہا ——— ایک معصوم مگر

مصیبت زدہ بچے کی طرح وہ اٹھا اور شیریں کے کندھے پر سر رکھ کر رونے لگا۔

صدائیں دو، مرے گذرے ہوئے زمانے کو

شاید اس کا سبب یہ ہو کہ کمرے میں داخل ہوتے وقت کھڑکی کے نزدیک سے گزرنے کی وجہ سے ڈوبتے ہوئے سورج کی عقیق رنگ احمریں کرنوں نے اس کے حسین چہرے اور سنہرے بالوں کو قوس قزح کے رنگوں سے رنگ دیا، لیکن غیر روشن کمرے کے ایک خصوصاً تاریک کونے میں آرام کرسی پر پڑے ہوئے مجھے تو ایسا معلوم ہوا کہ وہ اب اپنے ہمراہ سبزہ زاروں کی تمام رنگینی، مرغزاروں کی سب شادابی اور لالہ زاروں کی جلوہ گستری، کمرے میں لیتا آتا، اور قبل اس کے کہ وہ میری طرف مڑ کر مجھے دیکھے، میں آہستہ سے ہنسا، اس نے خوشی کا ایک نعرہ لگایا، اور کودتا ہوا کمرے کے اس سرے سے اس سرے تک میرے پاس آیا، اس کی آنکھیں روشن تھیں، اس کی چال سے مسرت ٹپکتی تھی، اس کی نگاہوں سے سکون کامل نمایاں تھا اور جب وہ مجھ سے مصافحہ کر رہا تھا، یا بالفاظ دیگر میرے ہاتھ کو اپنے دوگنے بڑے ہاتھ میں دبا کر اس طرح ہلا رہا تھا، جیسے وہ کسی ریلوے اسٹیشن کے پانی کے نل کا دستہ ہے تو مجھے اس کے جسم اور کپڑوں سے بھینی بھینی، نفیس خوشبو آتی ہوئی معلوم ہوئی جیسی

بارش ہونے کے فوراً ہی بعد گلاب اور دوسرے پھولوں کے پودوں سے نکلتی ہے'

میں بہت حیران تھا' داراب کو میں اُس وقت سے جانتا تھا' جب میں اور وہ ننگے پاؤں اور ننگے سر' نیکر پہنے' دن بھر' صبح سے شام تک' درختوں پر چڑھتے' باغ میں لوٹتے' مٹی اڑاتے اور نہر میں پیرتے رہا کرتے تھے' بچپن میں وہ بہت خوش مزاج اور ہنس مکھ تھا' مگر بیرسٹری کے لئے انگلستان جانے سے کچھ دن قبل سے وہ متین اور سنجیدہ ہو کر خاموش اور غمگین سا رہنے لگا تھا' میرا خیال ہے کہ اس تبدیلی اور تغیر کا بڑا سبب اس کے والدین اور چھوٹے بھائی کی اچانک اموات تھیں' وہ عموماً کھویا ہوا سا' کسی سوچ میں مستغرق رہتا تھا' مگر اس وقت یہ معلوم ہو رہا تھا جیسے اُس کی کایا پلٹ ہو گئی ہے'

"داراب" میں نے کہا "بھئی' اس وقت تم سے مل کر بڑی ہی مسرت ہوئی اللہ علیم و دانا ہے' میں بیان نہیں کر سکتا' تمہارے آنے سے مجھے کس قدر خوشی ہوئی ہے'

"بیٹھو' نہیں' نہیں' وہاں نہیں' اس کرسی پر بیٹھو' اور جتنی باتیں ہو سکیں کرو" اس موقعہ پر مجھے اُسے کرسی پر بٹھانا پڑا' ورنہ اس کی کچھ عجیب و غریب حالت تھی' مارے خوشی کے ناچا جاتا تھا' "سگریٹ پیو گے"
"جس میں کمرے کی ہوا خراب ہو جائے' نہیں' اخمر' نہیں' البتہ تم اتنا

کرو کہ ذرا اس کھڑکی کو کھول دو تا کہ خالص ہوا اندر آسکے''

''تم ٹھیک کہتے ہو، سچی اور صحیح زندگی اسی کا نام ہے'' میں نے کھڑکی کھولتے ہوئے کہا، وہ گردن موڑے ایک تصویر کو دیکھ رہا تھا، میرے الفاظ سن کر اُس نے میری طرف منہ پھیرا، —

''کیا مطلب، اس آخری فقرے سے تمھارا کیا مطلب ہے''

''کھلے میدانوں اور رنگین وادیوں میں زندگی کا وقت گزارنا، میرا خیال ہے کہ تم پچھلے چھہ سات مہینے اسی قسم کی سیر و تفریح میں مشغول رہے، اور اب واپس آئے ہو تو معلوم ہوتا ہے، تم میں کسی نے نئی روح پھونک دی ہے، جیسے بارش سے بسنت کے شروع میں زرد اور خشک پتیوں میں از سر نو جان آجاتی ہے،

وہ تبسم جواب تک محض اُس کی آنکھوں میں یا لبوں کے کناروں پر نمایاں تھا، یک طویل اور مسلسل قہقہے کے صورت میں تبدیل ہو گیا، ''کھلے میدانوں میں، رنگین وادیوں میں مائی ڈیر اختر، تم معلوم نہیں کیا بک رہے ہو ارے برخوردار، میں نے تو ان مہینوں کا بڑا حصہ بند کمروں اور تاریک مکانوں میں گزارا ہے، اور سیر و تفریح کے بجائے مشکل اور دقیق کام میں''

اور پھر اُس نے قہقہے لگانا شروع کر دیئے، اس کی ہنسی ناقابل تدارک تھی، جیسے پریوں کی کہانیوں میں طلسمی گھڑے سے دودھ کالا تنا ہی سمندر اُبلا،

اسی طرح اس وقت داراب سے قہقہے اُبل رہے تھے‘۔

”کہیں نہ کہیں“ میں نے فیصلہ کن انداز سے کہا‘ ”ضرور تم کو آبِ حیات کا چشمہ مل گیا‘ اور تم نے جی بھر کے اُس کے پانی سے اپنی پیاس بجھائی‘ ورنہ آخر تم میں اس تغیر کی کیا وجہ ہے‘ تم یکقلم بدل گئے ہو‘ بالکل تبدیل ہو گئے ہو‘ جیسے کسی معمولی لوہے کے ٹکڑے میں مقناطیسی کشش پیدا ہو جائے مجھے بھی دنیا کی ہنگامہ آرائیوں پر اسی استغنا آمیز انداز سے ہنسنا سکھا دو اور میں تمھارا غلام ——————“

”بہت آسان کام ہے‘ تم اتنا سمجھ لو یہ دنیا ہماری کچھ نہیں ہے‘ بس ایک مذاق ہے‘ ایک ٹھٹول‘ بڑا بھاری ٹھٹول“

”یہ کہنا تو بہت سہل ہے‘ مگر داراب یہ تصور کرنا اتنا ہی دشوار ہے‘ جب تک آدمی اس مذاق اور اس ٹھٹول کو آنکھوں سے نہ دیکھ لے‘ کس طرح اس کا قائل ہو سکتا ہے“

یہ تو اور آسان ہے‘ جس وقت تم مغموم اور افسردہ ہو‘ اس وقت ایک گہری سانس لو‘ پنجوں کے بل کھڑے ہو جاؤ‘ خود کو یہ باور کرا دو کہ تمام دنیوی ہنگامہ آرائیاں‘ تصادم و تضارب‘ شکست و فتح‘ عیش و غم‘ لوازم و ملحقات تمنائیں‘ اور کاوشیں‘ یہ سب محض تمھیں دکھانے کی غرض سے ایک تماشہ ہیں‘ ایک سینما کا فلم ہیں‘ ایک ناٹک کا پردہ ہیں‘ —————— زندگی نام ہی بے حسی کا ہے‘ تم یہ سوچ لو کہ باقی سب نفوس اداکار ہیں اور تم ناظر‘

______ فرض کرو کہ تم کسی امیر یا نواب کی دولت اور امارت کے سبب، اس پر رشک کرتے ہو، تو اُس وقت یہ یاد کرو کہ اس نواب یا رئیس کا لڑکا یقیناً اپنے دل میں یہی سمجھیگا کہ اُس کا باپ محض ایک خوش قسمت بیوقوف تھا، یا فرض کرو کہ تم کو کسی عورت سے محبت ہو جائے اور ...." اس مقام پر اس کی بے پایاں ہنسی اس کی تاب گویائی پر غالب آگئی، لیکن اب میرے جذبات کو ٹھیس لگ چکی تھی اور مجھے اس کی باتوں میں دلچسپی ہو چلی تھی، میں نے کہا، "محبت اور عورت ___ واہ اب تم کیا جانو، محبت کس کو کہتے ہیں اور اس کا کیا مفہوم ہے؟"

"اختر، محبت تو تمام ستم ظریفیوں میں سب سے بڑی ستم ظریفی ہے یہ محبت ہی تو تھی (قہ، قہ، قہ) جس نے مجھ کو اس نئے لیکن صحیح راستے پر ڈالا، اور ایک عورت ___ (قہ، قہ، قہ) ہی تھی، میری آنکھیں کھولنے کا سبب، میری اس لا انتہا ہنسی کا منبع، اور ہنسنا۔ (قہ، قہ، قہ) ہنسنا، اختر جانتے ہو کیا ہے، کامیابی کا راز، کامرانی کی کنجی، کامگاری کی کلید۔"

اس نے آنکھوں سے آنسو پونچھے اور مسکراتے ہوئے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "دیکھو اختر، میری طرف دیکھو ___ ایک مہینے تک مجھ سے زیادہ سنجیدہ اور خاموش، مجھ سے بڑھ کر محنتی اور دماغ سوز، بیرسٹر شہر بھر میں نہ تھا، میں کہیں نہیں جاتا تھا، لوگ مجھے کبھی دعوت نہیں دیتے تھے، اس لئے کہ میرے چہرے پر بس ایک نظر ڈالنے سے انھیں پتہ چل جاتا تھا کہ میں

کیا ہوں اور کس قسم کا آدمی ہوں، اور اب .... لو دیکھو، یہ ٹینس کلب کے سالانہ جلسے کا دعوتی رقعہ ہے، یہ گورنر کے یہاں عصرانے کا بلاوا، یہ انگل کی پہلی شب کا انویٹے شن، یہ لیڈی سہراب نوروزجی کے یہاں ڈنر اور رقص کا دعوت نامہ اور یہ باقی سب لفافے بھی اسی قسم کی چیزیں ہیں"

اس موقعہ پر اس نے ایک درجن سے زیادہ رنگین اور معطر لفافے جیب سے نکال کر میری گود میں ڈال دیئے۔

"ان کی خوشبو سونگھو اختر، خوشبو، میں تم سے کہتا ہوں، میں بلا مبالغہ اس زمانے میں عطر و رنگ میں زندگی بسر کرتا ہوں، یہی صبح کا ناشتہ ہیں، یہی دن کا غسل، اور انھیں سے شب کو کھانا ہوتا ہے، کسی کو معلوم نہیں کہ میں ہوں کیا، اور یہ معلوم کرنے کی غرض سے لوگ مجھے مدعو کرتے ہیں، لیکن پہلا وہ شخص کیسے ادھر ادھر مارا مارا پھر سکتا ہے جس کی عنقریب شادی ہونے والی ہو،

"داراب" میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا "تمہاری شادی ہونے والی ہے، کہاں، کب، کس سے، مائی ڈیر داراب، تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتایا" میں یہ کہتا جاتا تھا، اور دل میں رشک کا دریا موجزن تھا۔ "مگر داراب خدارا، مجھے بھی تو وہ ترکیب بتاؤ جس سے تم نے یہ کامیابی حاصل کی، مجھے بھی اس خزانے کا "وکھل سمسم" سکھا دو، پھر میں تمھیں پوری مبارکباد دوں گا"

تھوڑی دیر تک فلسفیانہ انداز سے اس نے میرے چہرے کی طرف دیکھا

پھر آنکھ مار کر بڑے زور سے ہنسا ۔

"اچھا تو یہ سبب ہے تمھاری اس تمام افسردہ دلی کا" یہ راز ہے اس جلد بے کیفی کا میں نے اُس کے اس کے ریمارک کی صحت کو تسلیم کر کے سب کچھ قبول دیا ۔

"مگر داراب ، اور تو سب راضی ہیں ، اس کے والدین ، میرے ماں باپ ، ہم دونوں کے جملہ اعزا ، مگر وہ قتالہ عالم خود رضامند نہیں ، وہ ایک بار سے دوسری بار میری طرف دیکھنے پر تیار نہیں"

"اس کا علاج ایک ہی ہے ، تم بھی دل میں تصور کر لو کہ پچیس[۲۵] سال کے بعد وہ ایسی ہو جائے گی کہ کوئی مرد اس کی جانب دوبارہ دیکھنے کا روادار نہ ہو گا ، اس سے تمھیں یقیناً تسلی ہو جائیگی"

"یہ تو خیر تم مذاق کر رہے ہو ، مگر داراب میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ اس کے بغیر میری زندگی محال ہے"

"اس قدر شدید محبت" اس نے مصنوعی سنجیدگی سے بھویں اوپر چڑھا کر کہا ،

"اور اس درجہ ناکام اور مایوس کن" میں نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے جواب دیا ، اس کے لاتمناہی قہقہے پھر کمرے میں گونجنے لگے ، اور اس کی ہنسی اس قدر متعدی تھی کہ میں بھی مسکرا دیا ،

"ایک عورت کا معاملہ اور مایوس کن ــــ اختر ــــ مائی ڈیر اختر ،

عورت کا معاملہ کبھی بالکل مایوس کن نہیں ہوتا، کوئی نہ کوئی صورت اُس کو کامیاب بنا لینے کی ضرور ہوتی ہے، ایک مہینہ پیشتر میرا بھی یہی خیال تھا اور یہی حال میں اُسی جہاز میں تھا جس میں اس وقت تم ہو اور اب ———— میری جانب دیکھو، آخر (قہ، قہ، قہ ہا، ہا، ہا)"

"لیکن داراب، میری محبوبہ، لاکھوں میں ایک ہے —— خوبصورت، امیر، عالی نسب، تعلیم یافتہ، جوان"

"یہہ تو تم بالکل میری معشوقہ کی تصویر کھینچ رہے ہو، اور اسے میں بالآخر راہ راست پر لے ہی آیا۔ تو سنو۔ (قہ قہ۔ ہا، ہا) کاش تمام عالم میرے اس بیان کو سننے کے لئے اس وقت یہاں ہوتا (قہ، قہ، قہ ہا ہا ہا ہا)"

"داراب" میں نے سختی سے کہا، "داراب، خدا کے واسطے اپنے ان قہقہوں کو بند کرو، ورنہ میں پاگل ہو جاؤں گا..................
تو ہاں پھر بیان کرو،

"سنو ———— وہ اس قسم کی لڑکیوں میں سے ہے جن کی تصویر اور جن کی یاد مردوں کے دلوں میں ہمیشہ باقی رہتی ہے، میں نہیں کہتا کہ وہ خوبصورت ترین عورت ہے لیکن شوخ ترین ضرور ہے، اور تم اگر بغور سوچو گے تو اس نتیجہ پر پہونچ جاؤ گے کہ عورت کے لئے شوخ ہونا ہی حسین ہونے کا مرادف ہے، کم سے کم شادی کے سال بھر بعد تو یہ چیز بالکل صحیح ثابت ہوتی ہے تم اس کے خاندان سے ضرور واقف ہو گے، اور ممکن ہے کہ کسی جلسے یا پارٹی میں

یا کہیں کسی اور کھیل تماشے میں اُسے دیکھا بھی ہو ـــــــ فیروزہ پستن جی ڈنشا، ـــــــ مشہور پستن جی ڈنشا ء"

میں نے نفی میں سر ہلایا، دادا بھائی نوروزجی، داراب جی ٹاٹا، فریدوں جی ملا، واڈیا، ڈنشا، میں نے ان پارسیوں کے اتنے نام سنے تھے اور اتنے پیچیدہ، کہ اگر میں نے کبھی پستن جی ڈنشا کا نام سنا بھی تھا تو مجھے یاد نہ تھا، ٹاٹا کا نام تو البتہ میرے ذہن میں اسی طرح محفوظ ہے جس طرح قلعہ دہلی کا نام لال قلعہ، باقی اور نام مجھے کبھی یاد نہ رہ سکے۔

داراب کے خوش وضع چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں ہوئے

"مائی ڈیر اختر ـــــ تم نے پستن جی ڈنشا کا نام نہیں سنا، بعض وقت مجھے خیال ہوتا ہے کہ تمھاری قابلیت کے یہ تمام شہرے محض ڈھونگ ہیں اور تم نہایت نالائق ہو (قہ قہ قہ قہ ہاہاہا)" اس کی ہنسی اور قہقہوں نے مجھے اس کی درگت بنانے سے باز رکھا، کیونکہ میری رائے میں بے اختیارانہ انداز سے ہنستا ہوا مرد عورت کے مثل ہے،

میں تم سے کیا بیان کروں وہ کیسی ہے، بس یہ سمجھ لو کہ وہ کمال کی معراج ہے۔ اس کی حیثیت ایک اونچے مینار یا برج کی سی ہے کہ خود تو اپنے باپ کی لا انتہا دولت پر استادہ ہے۔ (وہ پستن جی ڈنشا کی اکلوتی لڑکی ہے) ـــــــ اور اس کا سایہ دور تک اور چیزوں پر پھیلا رہتا ہے"

"اور تم ـــ داراب ـ تم اُس سے منسوب ہو اور عنقریب شادی ہونیوالی ہے" میں نے طنزیہ لہجہ میں کہا،

داراب نے زور سے ہاتھ ہلایا "دیکھو بھی اختر! جب میں اُس کا تذکرہ کرتا ہوں کبھی مجھے موضوع سے پھیرنے کی کوشش نہ کرنا سمجھے ـــ تو ہاں بڑی دلکش لڑکی ہے خوش مزاج، خوش طبع، خوش رو، خوش آئین، مخلص، سیدھی، کالج سے واپس ہوتے ہوئے اُس کا ایک دن مجھ سے سامنا ہوگیا، میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ اُس نے میری طرف نگاہ بھی نہیں کی، کیونکہ پانچ ہندسوں سے کم کی ماہوار آمدنی والے کو دیکھنے کے لیے اُسے عینک استعمال کرنے کی ضرورت پڑتی ہے، اور تنخواہ دار اشخاص کے لیے شاید طاقتور خوردبین بھی کافی نہ ہو"

میری نظر میں داراب کی وقعت بڑھ گئی، جو شخص اپنی منگیتر کا اس آزادانہ طریقے سے ذکر کرے وہ یقیناً قابل عزت ہے،

"تم فیروزہ کو ان جزئیات کی وجہ سے بڑا نہیں ٹھہرا سکتے، یہ اس کی گھٹی میں پڑی ہوئی ہیں، اس کے خاندان کی امارت اور دولت آج کی نہیں، صدیوں کی ہے، بلکہ بعض آدمیوں کا خیال ہے کہ آدم کا وہ بیٹا جو ان کا مورث اعلیٰ تھا وہ بھی کروڑپتی تھا،

ـــــ "ہاں تو اب تم کو کچھ کچھ اندازہ ہوگیا ہوگا کہ فیروزہ کیا چیز ہے، ـــــ وہ چھچھوری یا شیخی خور نہیں، مگر کو لمبس کے لئے نئی دنیا

دریافت کرنا آسان تھا بہ نسبت اس کے کہ فیروزہ کسی ایسے شخص سے ملاقات کرے جس کے نام کے ساتھ دو چار طویل و شستہ خطابوں نہ لگے ہوں، ظاہر ہے کہ یہ تمام امور مجھ کو ایک وقت میں معلوم نہیں ہو گئے، رفتہ رفتہ میں نے ان کو معلوم کیا، کالج سے وہ ایک دن موٹر میں جا رہی تھی کہ میں نے اسے دیکھ لیا اور بس عاشق ہو گیا! اگلے دن ایک عصرانہ تھا جس میں محض رؤسا مدعو تھے، مگر میں مگر دم لڑا کر پہنچ ہی گیا، پہلے تو وہ مجھ سے اس شبہہ میں باتیں کرتی رہی کہ میں بھی کوئی لکھ پتی ہوں۔ لیکن جب اُسے معلوم ہوا کہ میں نانا کے خاندان کا وارث نہیں، تو پھر اس نے میری طرف مڑ کر بھی نہ دیکھا، دوسرے دن میں اس کے مکان پر گیا، معلوم ہوا اُن کے سر میں درد ہے مل نہیں سکتیں، اور دو گھنٹے کے بعد میں نے خود انھیں ایک نہایت منہ زور گھوڑے پر سوار پارک میں گھومتے ہوئے دیکھا، سمجھدار آدمی کو یہ اشارہ کافی ہونا چاہئے تھا مگر میرا عشق ایسا ویسا تھوڑا ہی تھا، میں نے بھی سوچ لیا کہ ایڑی چوٹی کا زور لگاؤں گا پھر معاملہ تو اللہ کے ہاتھ ہے ہی" ——— "میں نے اپنے تمام ایسے دوستوں سے جو کھانے پیتے تھے اشارۃً، بالکہ مس فیروزہ پیستن جی ولنشا کی صحبت مجھے بہت عزیز ہے، بس پھر کیا تھا، ہر سو لے پر جہاں وہ رہا تی، میں پہلے سے ڈٹا ہوتا، یہ ضرور ہے کہ وہ مجھ سے شاذ ہی باتیں کرتی تھی، اجتنی الہور کی تم سے یا مجھ سے کرے، مگر جو کچھ میں کہتا تھا، اس کے سننے پر تو وہ

تھی ، رفتہ رفتہ میں نے اُس کو اپنے سے دلچسپی پیدا کرا ہی دی، تم عورت کی فطرت سے واقف ہو، وہ ملکہ ہی کیوں نہ ہو مگر اس امر کا احساس، یہ علم کہ ایک شخص اس کی پرستش کرتا ہے، اس کی روندی ہوئی خاک کو آنکھوں سے لگاتا ہے، اُسے متاثر کئے بغیر رہ نہیں سکتا۔ اور میرا عشق کچھ چھپا دبا نہیں تھا۔ میں اُسے چھپانے کی کوشش ہی نہیں کرتا تھا۔ ——

رفتہ رفتہ میں نے اس کا روز کا پروگرام معلوم کر لیا، اب یہ ہوا کہ بغیر مجھ سے ملے یا مجھے دیکھے وہ گھر سے نکل نہیں سکتی تھی، اس کے لئے تو خیر یہ تکلف تھا ہی لیکن میرے لئے مکلف تر، میرا وزن کم ہو گیا، بیرسٹری ویرسٹری سب چولھے بھاڑ میں گئی، مسکرانا میں بھول گیا، غذا میں نے کم کر دی، محض سگریٹ اور چائے پر گزر نے لگی، نتیجہ یہ ہوا کہ ایک دن جب میں بستر سے اٹھا تو دنیا میری نظروں میں تاریک ہو گئی، میز کرسیاں گھومتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ کمرہ ناچتا ہوا، اور میں بیہوش ہو گیا۔ یہ باعث ہوا، میرے گنگولی کے پاس جانے کا، ڈیر، ڈیر، گنگولی" (قہ قہ قہ ہا ہا ہا، قہ قہ قہ ہا ہا ہا) ہنستے ہنستے اُس کے آنسو نکل آئے، سانس پیٹ میں نہیں سماتی تھی۔

"کون گنگولی" میں نے کہا "ڈاکٹر گنگولی، ہندوستان کا مشہور ترین ماہر اعصاب"

"وہی وہی، جس کا ذاتی سنیٹوریم سمندر کے کنارے ہے، ظاہر ہے کہ اس کی فیس میرے امکان سے باہر تھی، لیکن میں اور وہ یہاں کالج میں

بھی ساتھی تھے، اور کیمبرج میں بھی، اس کے باپ اور میرے والدین بھی بہت گاڑھی چھنتی تھی، کیمبرج میں وہ کالج کا بدصورت ترین لڑکا مشہور تھا، مجھ سے مل کر بہت اچھلا کودا، جب مصافحے اور معانقے سے فرصت ہوئی تو میں نے سب کچا چٹھا بیان کیا، پانچ منٹ میں اس نے کرید کرید کر مجھ سے رتی رتی ریزہ ریزہ حال معلوم کر لیا، جتنے سوالات اس نے مجھ سے کئے وہ اسی قسم کے تھے، ——— "کب تم پہلی بار اس لڑکی سے ملے" ——— "دوسری ملاقات میں کتنی دیر گفتگو ہوئی" ——— وعلیٰ ہذا۔ جب میں نے فیروزہ کی صورت اور اس کے حسن کا حال بیان کرنا شروع کیا اور آدھ گھنٹے میں محض سر کے بالوں سے گزر کر آنکھوں تک پہونچا تو اس نے مجھے روک دیا۔

"سنو اراب" اس نے کہا "میری کامیابی کا راز اس حقیقت میں مضمر ہے کہ میں انسانوں کو محض مضغۂ گوشت و خون سمجھتا ہوں، جس میں اتنے اعصاب ہوتے ہیں، اور اتنے اعضا ——— اور ظاہر ہے کہ ہر عورت خواہ وہ قلوبطرہ ہو یا ہیلن، پدمنی ہو یا نورجہاں، گریٹا گاربو ہو یا مس فیروزہ پسیتن جی ڈنتا۔ بہرحال انسان ہوتی ہے، کھانا پینا اس کے لئے ضروری ہے، بوڑھا ہونا اس کے لئے لازمی ہے، بہ ظاہر اسباب تمہاری صحت کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس سے تمہاری شادی کرادی جائے، میں تمہارا علاج کروں گا"

خوشی کے مارے میں اچھل پڑا، اور گنگولی سے لپٹ گیا، بہ مشکل اس نے خود

کو الگ کیا میں نے کہا "گنگو لی تم میری مدد کرو گے، تمھاری ذہن میں کوئی ترکیب ہے، کوئی امید کامیابی کی پڑتی ہے" اس نے کہا " ہاں کل اسی وقت آؤ تو میں ترکیب بتاؤں گا" ——— میں اس وقت چلا آیا، لیکن چوبیس گھنٹے یہ معلوم ہوتا تھا کہ میں ہوا پر اُڑ رہا ہوں، ٹھیک وقت پر میں دوسرے دن گنگولی کے یہاں پہونچا، اُس نے کہا " میں نے تمھارے مسیحا کا معائنہ کرلیا " میں اچھل پڑا

" گنگولی، کہیں تم نے اس سے میرا ذکر تو نہیں کر دیا" اُس نے اس سوال کو کلیتہً نظر انداز کرکے سلسلہ کلام جاری رکھا " تمھاری خوش قسمتی سے میں اُس سے اور اس کے باپ سے پہلے سے واقف ہوں، میں نے ایک بار اس کے باپ کا علاج بھی کیا تھا"

" کیوں گنگولی، ہے نہیں وہ حسین حُسنِ مجسّم"

" لیکن کم سے کم اس عشق کے بخار سے مبّرا ہے"

" اس کے معانی یہ ہوئے کہ میرا معاملہ بالکل مایوس کن ہے" میں کہا اور کرسی پر گر پڑا

" تندرست آدمیوں کو بھی جراثیم پہونچا کر امراض میں مبتلا کیا جا سکتا ہے، گنگولی نے جواب دیا" میرے دل کے اندر رقابت کی آگ بھڑکنے لگی،

" مثلاً تم خود" میں نے بدقت جواب دیا،

میرے اس جواب پر گنگولی قریب قریب مسکرا دیا'
"نہیں وارداب ، نہیں' ڈاکٹر کے لئے اور خصوصاً میرے لئے قلب ایک عصب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا' تندرست آدمیوں کی جانب اشارہ کرنے سے میری مراد لڑکی ہے۔"
میں نے گنگولی کو سر سے پیر تک دیکھا اور بالکل مطمئن ہو گیا کیونکہ گنگولی دنیا کے نصف درجن بدصورتوں میں سے ضرور ہے' اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔ "ملاقات محض سرسری تھی' اور میں اتنا کھویا ہوا سا تھا کہ گفتگو میں دلچسپی پیدا کرنے کی غرض سے مس فیروزہ کو طبی معاملات بحث میں لانا پڑے' چلتے وقت میں نے باتوں باتوں میں اس سے حال میں اخبار میں آئے ہوئے انگلستان کے ایک دلچسپ واقعے کی تفصیلات بھی بیان کر دیں' جہاں ایک نوجوان کو محض اس سبب سے فالج ہو گیا کہ اس کی معشوقہ نے اس سے عقد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اور اسی میں وہ مر گیا،،
"یہ واقعہ کس اخبار میں تھا" میں نے بے چینی سے دریافت کیا۔
"مجھے اخبار کا نام اس وقت یاد نہیں۔ مس فیروزہ کو فوراً اس واقعے سے بہت دلچسپی ہو گئی' اور انھوں نے مجھ سے مزید تفصیلات دریافت کیں' میں نے انھیں بتایا کہ اس قسم کے واقعات طبی دنیا میں نرالے نہیں اور کوئی اچانک دھچکا انسان کے کل اعصابی اور اعصلاتی نظام العمل کو حالت جمود میں ڈال سکتا ہے' جس وقت میں رخصت ہوا مجھے اچھی طرح یقین تھا کہ

اومی محبت کے سبب مر بھی سکتے ہیں، سمجھے واراب، اس کے معنی یہ ہیں کہ بالفاظ دیگر تمھارے اور اس کے میاں بیوی ہونے میں اب کوئی کسر باقی نہیں"

"گنگولی" میں نے چیخ کر کہا "خدارا مجھے بتاؤ کہ کس طرح ایسا ہو سکتا ہے، تم تو پہیلیاں بجھا رہے ہو"

تب گنگولی نے اپنی ترکیب بوضاحت مجھ سے بیان کی اور مجھے اپنے دروازے کے باہر کر دیا ——— میں گھر واپس آیا اور دو دن تک تیاریوں میں منہمک رہا آخر کار مجھے موقعہ مل گیا اور جب وہ پارک میں تنہا سواری کر رہی تھی، میں نے اُسے گھیر لیا، میری شکل دیکھ کر اسے ایک حد تک خوف معلوم ہوا، کیونکہ اس کا رنگ بدل گیا اور وہ اپنا گھوڑا پیچھے ہٹانے لگی، لیکن پھر فوراً ہی سنبھل گئی، اس وقت وہ بہت حسین معلوم ہوتی تھی، ورزش اور کھلی ہوا نے اس کے عارض کو رنگین بنا دیا تھا، سواری کا لباس اس پر بڑی طرح کھل رہا تھا، میں یہ مرقع حسن دیکھ کر چند سکنڈ خاموش رہا، پھر آگے بڑھ کر میں نے کہا "فیروزہ، میں نے اس وقت تم کو ایک مجنونانہ درخواست کرنے کے لئے روکا ہے! میں تم سے محبت کرتا ہوں"

اس کے چہرے پر سختی پیدا ہو گئی، اُس نے میری طرف دیکھا جیسے کوئی بیمار بچے کو دیکھتا ہو؟

"واقعی"

مجھے اس وقت ایسا محسوس ہوا جیسے جرمنی اور روس کے میدان جنگ میں ایک کاغذ کاٹنے کا چھوٹا سا چاقو لئے ہوئے میں جرمنی کے توپ خانے پر حملہ کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، میری نا امیدی قریب تھا کہ میری ہمتوں کو پست کر دے، مگر گنگولی کی ہدایت نے یاد آکر مجھے اَز سرِ نو امید دلائی،

"فیروزہ" میں نے بیکسانہ انداز سے کہا، "فیروزہ — کیا میں کوئی امید نہ رکھوں، کہ تم کبھی میری بیوی بن سکوگی"

"مجھے نہایت افسوس ہے، اور آپ کی حالت پر بہت ترس آتا ہے مگر یہ ناممکن ہے، براہ کرم راستے سے ہٹ جائیے"۔

مجھے یقین ہے کہ میں نے اس وقت کا پارٹ بہت خوبی اور ہشیاری سے انجام دیا، میرا بید زمین پر گر پڑا ـ میرے بازو مُردوں کی طرح بیجان ہو کر لٹک پڑے، میری گردن آگے جھک گئی، اور میں درختوں کے جھنڈ میں شرابیوں کے مانند جھومتا لڑکھڑاتا چل دیا ——— لیکن اصلیت میں میری یہ حالت نہیں تھی، چوری سے میں نے مڑ کر اس کی طرف ایک نگاہ کی، اب تک وہ وہیں تھی، اور میری جانب عجیب انداز سے دیکھ رہی تھی،

میں سیدھا گنگولی کے یہاں پہونچا، اُس نے مجھے فی الفور اپنے سنیٹوریم میں بھجوا دیا، اور اُسی نے تمام مشہور اخباروں کو یہ خبر بھجوا دی کہ "مشہور ولایت بیرسٹر، ——— داراب ہمایون ٹاٹا ——— جن سے اہل ملک کی بڑی بڑی امیدیں وابستہ تھیں، دفعتاً اور کسی ظاہری سبب کے بغیر

فالج میں مبتلا ہو گئے ہیں۔" ظاہر ہے کہ یہ سب بالکل غلط تھا، مگر گنگولی نے
خوب نمک مرچ لگا کر اس واقعہ کو اچھی طرح رنگ دے کر کچھ اس قسم کا مضمون
شائع کرا دیا کہ گویا میں بہ مشکل چوبیس گھنٹے یا اڑتالیس گھنٹے اور زندہ رہونگا
دوسرے دن شام کے قریب گنگولی میرے کمرے میں آیا، میں سفید صاف
شفاف لباس پہنے، بستر پر بیٹھا بھنا ہوا مرغ کھا رہا تھا، اس نے کہا کہ
ابھی ابھی مس فیروزہ کے یہاں سے ٹیلیفون آیا تھا کہ آج کے ٹائمز میں مطبوعہ
واقعہ کے متعلق مزید تفصیلات درکار ہیں، مریض کا نام واقعی وارا ب
ٹاٹا ہے، وہ بیرسٹر ہے یا کچھ اور،" گنگولی نے اُسے یقین دلایا کہ واقعی
اس کے زیر علاج مریض یہی، نام ہے اور یہی پیشہ، اور ساتھ ساتھ مزید
ایسی تفاصیل بڑھا دیں جن سے اُسے یقین ہو گیا کہ مریض وہی داراب
ہمایوں ٹاٹا ہے، جس کی درخواست کو اس نے گزشتہ روز مسترد کر دیا
تھا، مثلاً اس نے یہ کہہ دیا کہ مریض کی حالت سرسامی ہے اور عالم بیہوشی
میں اسے برابر لفظ "فیروزہ" کی رٹ لگی ہے ———— مس فیروزہ
پستن جی ڈنشا و نے اُسی رات میں میری خیریت دریافت کرنے کے لئے
دو بار آدمی بھیجا، صبح کو گلاب کے سفید پھولوں کا ایک خوشنما گچھا بھی آیا،
بس پھر کیا تھا، میں نے اسی سفید لباس میں کمرے بھر میں ناچنا شروع
کر دیا، نرس نے میری یہ حالت دیکھ کر ایک چیخ ماری اور گو وہ اچھی خاصی
ہٹی کٹی تھی مگر میں بھلا کیا اُس کے سنبھالے سنبھلتا، جب دو چپراسی باہر

سے آسے تو میں بستر پر لٹایا جا سکا، نرس نے فوراً ڈاکٹر گنگولی کو مطلع کیا،
وہ ہانپتا کانپتا آیا، مجھے دیکھا، نبض، دماغ، سینہ، سب کا امتحان
کیا، اور نرس کو اطمینان دلایا کہ اس قسم کے دورے مریض کو پڑنا لازمی
ہیں، مرض کی نوعیت ہی ایسی ہے، نرس فہمیدہ تھی وہ مشتبہ رہی
آخر کار مناسب یہی سمجھا گیا کہ اُسے بھی اس سازش میں شریک کر لیا جائے،
جب نرس نے یہ سب قصہ سنا تو ہنستے ہنستے اُس کے آنسو نکل پڑے، وہ
بڑی علاوہ طبیعت کی نرس تھی، اس نے دل وجان سے میری شرکت گوارا کی،
اور گنگولی نے حکم دیدیا کہ آیندہ سے مسٹر داراب کی حالت کے متعلق تمام
ٹیلیفونی پیغامات کا جواب مس نیو MISS K'NEW دیں گی
ٹیلیفون میرے کمرے کے دروازے کے برابر تھا، اور مس نیو جو کچھ
کہتی تھیں میں اس کا حرف حرف سن لیتا تھا، پہلا پیغام دوپہر کے قریب
آیا جب میں بستر پر بیٹھا، انڈوں اور مٹن چاپ کا لنچ اڑا رہا تھا،
"ہیلو، ہاں، میں مس نیو ہوں، مسٹر داراب کی نرس، جی ہاں،
بہت عجیب و غریب واقعہ ہے، نہیں کوئی اُمید زندگی نہیں، ممکن ہے
دو ایک روز اور چل جائیں، جی ہاں سرسامی کیفیت بدستور ہے، برابر
"فیروزہ" کا لفظ زبان پر ہے، نہیں نہیں، نیند کا کوئی سوال نہیں، ایسا
مریض کبھی نہیں سوتا ——— ہرگز نہیں، ڈاکٹر کی اجازت نہیں
کہ کوئی شخص بھی مریض کو دیکھنے آسکے، معمولی سے معمولی دھوکا بھی ممکن ہے کہ

قاتل ثابت ہو"

"بالکل مہمل اور لغو" ——— میں نے چیخ کر کہا "مس نیو آخر یہ تم نے کیا کیا، ارے مقصد تو یہی ہے کہ کسی طرح فیروزہ کو اس کمرے میں بلایا جائے اور تم نے اُسے ٹکا سا جواب دیا کہ کوئی مریض کے پاس نہیں آسکتا"

"ہاں مقصد تو یہی ہے مگر ابھی اُسے ایک آدھ دن اور انتظار کرنے دو" چند منٹ تک تو میری سمجھ میں اس بات کی اہمیت نہیں آئی، پھر میں وہم سے بستر پر گر پڑا ——— عورت کا وار بہ ظاہر بہت معمولی اور خفیف ہوتا ہے مگر نہ کبھی خالی جاتا ہے نہ جلد بھرتا ہے ——— اُسی روز سہ پہر کو مس فیروزہ پیسٹن جی ڈنشا خود بہ نفس نفیس سینی ٹوریم کو تشریف لائیں، اور ڈاکٹر گنگولی سے پرائیوٹ ملاقات کی۔ میں اپنی زندگی کا ایک قیمتی سال اس موقعہ پر موجود ہونے کے لئے دینے کو تیار تھا، مگر ظاہر ہے کہ یہ ناممکن تھا، گنگولی نے بعد کو مجھ سے مفصل اس ملاقات کا حال بیان کیا،

اس نے اسے پچھلے ڈرائنگ روم میں دس پانچ منٹ منتظر رکھا، پھر خود آپریشن روم کے لئے مکمل طور پر تیار ہوا، سفید ٹوپی، ڈھاٹا، وغیرہ سب پہنے، اور بدصورت تو وہ خوش نما سے خوشنما لباس میں بھی معلوم ہوتا تھا، اس صورت میں تو بالکل تمھارے یہاں کے نکیرین سے مشابہ ہو گیا، اور وہ بھی بہت خوفناک نکیرین، اس کے بعد وہ ڈرائنگ روم میں آیا،

"ہلو، مس ڈنشا" "میں بہت مصروف ہوں، کہئے کیا کہنا ہے،
ذرا جلدی کیجئے"

"میں معافی چاہتی ہوں کہ آپ کے کام میں ہارج ہوئی، میرا خیال
ہے کہ مجھے آپ کی فرصت کے اوقات میں حاضر ہونا چاہئے تھا"

"یقیناً" گنگولی نے درشتی سے کہا، اور مڑکر دروازے کی جانب
چل دیا، جب دروازے تک پہونچا تو ایک نحیف آواز نے اُسے مخاطب کیا
"ڈاکٹر گنگولی" ——— تیزی سے وہ پلٹا "ہاں کیا کہتی ہیں
آپ"

فرطِ اضطراب و ندامت سے اس کا رنگ سفید ہو گیا، لیکن دل کڑا
کے اس نے تمام قصہ گنگولی سے بیان کر ہی دیا کہ کس طرح وہ چند بار داراب
ہمایون ٹاٹا سے ملی کیونکہ اس نے اس سے شادی کی درخواست کی، ظاہر ہے
کہ اُس میں اور مس فیروزہ میں اتنا فرق تھا کہ ایسا خیال کرنا ہی مضحکہ خیز تھا
اُسے گمان ہے کہ شاید داراب ہمایون ٹاٹا مخبوط الحواس اور کمزور دماغ کا آدمی
ہے، اس موقع پر گنگولی نے پہلا بم پھینکا، اس نے مس فیروزہ سے کہا کہ جہاں
تک دماغ اور حواس کا تعلق ہے، ان میں کمزوری کا صرف ایک شائبہ جو
اس نے داراب میں پایا ہے وہ یہ ہے کہ وہ بیوقوفوں کی طرح ایک معمولی
عورت کے لئے اپنی جان دیئے دے رہا ہے، اب رہا سوال ذہانت کا تو
داراب کیمرج میں ایسا طالب علم تھا اور ایسا مقرر تھا اور شہر کے بیرسٹر جو کچھ

زمرے میں اس کے متعلق ایسا خیال تھا، ——— آخر میں اس نے کہا کہ وارا ب جو اس کے لئے اپنی جان دئے دے رہا ہے، ذہانت اور قابلیت دماغی میں آدم سے لے کر اب تک کے تمام سٹین جیون اور ڈونلناؤں سے مجموعاً برتر ہے۔"

اختر تم نے گنگولی کو دیکھا ہے، ——— اچھا ——— اب ذرا تصور کرو، بھدا اور بدنما گنگولی، غصے سے چقندر کی طرح لال، کمرے میں پھرتے ہوئے گینڈے کی طرح اِدھر سے اُدھر پھر رہا ہے، اور بیچاری فیروزہ، درزی کے ماڈل کی طرح خاموش، تصویر سنگ کی طرح ساکت کھڑی ہوئی، یہ سب کچھ سن رہی ہے، آخر کار وہ رونے لگی، گنگولی نے دیکھا کہ اب موقعہ نازک ہے، بس اس نے باتوں کا رخ بدل دیا، اس نے معذرت کی کہ "شاید غصے کے دوران میں وہ ایسی باتیں کہہ گیا جو اس کے منصب کے خلاف تھیں ——— بہرحال اس کا وقت قیمتی ہے، اس لئے مس فیروزہ کو جلد بتانا چاہئے کہ وہ کس غرض سے اس وقت اس کے سینی ٹوریم آئی ہیں۔" فیروزہ نے جواب دیا کہ "وہ اپنے طرزِ عمل پر پشیمان ہے اور اس کے یہاں آنے کا مقصد محض بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے مریض کی آخری ساعتوں کو آسائش آمیز بنانا ہے" ———

اس وقت گنگولی نے اپنا آخری حربہ استعمال کر ڈالا، اس نے کہا کہ "مریض کی زندگی سے بہ ظاہر تو بالکل مایوسی ہے، لیکن ایک خفیف سا شائبہ اُمید کا یہ ہے کہ اس فیروزہ کو دیکھ کر یا تو وہ فوراً مر جائے گا، یا پھر یقیناً بچ جائے گا، کل صبح سویرے سورج نکلتے وقت وہ آئے، اگر مریض اس وقت تک بقیدِ حیات ہوا تو وہ

اسے ملا دے گا۔"

آدھی رات گے بعد سے ہم لوگوں نے فیروزہ کے آنے کی تیاری شروع کر دی، لیکن اگر نرس نہ ہوتی تو معاملہ بگڑ جاتا، اس کو تھیٹر میں کام کرنے کا موقع مل چکا تھا جس کی وجہ سے وہ بھیس بدلنے اور بدلوانے کے خفیہ رموز سے بخوبی واقف تھی، اس نے میرے منہ پر اس طرح پاؤڈر ملا کہ چہرے کا رنگ تھوڑے فاصلے سے بالکل زرد معلوم ہونے لگا، میری آنکھوں کے نیچے جلی ہوئی دیاسلائیوں کی راکھ سے سیاہی نمودار کی، غرض پورے طریقے سے مجھے موت کے منہ میں پھنسے ہوئے مریض کی طرح بنا دیا، کھڑکیوں کے پردے گرا دیئے، لیمپ کی روشنی بالکل دھیمی کر دی کہ کمرے میں ہر چیز دھندلی دھندلی دکھائی دے، پانچ بجے سے کچھ پہلے موٹر کے آنے کی آواز آئی، اور میں نرس سے ہاتھ ملا کر بستر پر مردے کی طرح پڑ گیا ——

دروازہ کھلا —— (میں نیم وا آنکھوں سے سب دیکھ رہا تھا) —— اور مس نیو اندر داخل ہوئیں اس کے بعد ڈاکٹر گنگولی اور ڈاکٹر گنگولی سے چند قدم پیچھے فیروزہ، —— نرس اور گنگولی تو میرے بستر کے پاس آ کر کھڑے ہو گئے لیکن فیروزہ دروازے ہی پر ٹھٹک گئی ——

"ان چھتیس ۳۶ گھنٹوں میں اس میں کس قدر تغیر ہو گیا ہے" گنگولی نے میری نبض دیکھنے کا بہانہ کرتے ہوئے کہا، گنگولی کے اس جملے پر فیروزہ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے، ظاہر ہے کہ باہر کی تیز روشنی کے بعد کمرے کی تاریکی

سے آشنا ہونے کے لئے اس کی آنکھوں کو دیر لگی، مگر جب اسے چیزیں نظر آنے لگیں تو اس کی نگاہ میرے زرد یرقان نما چہرے پر پڑی، تو مجھے خوب یاد ہے کہ اس کے لبوں سے اک آہِ سرد نکلی، اس نے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں اور دروازے کے پاس کی کرسی پر گر پڑی۔

گنگولی نے میری نبض کو تین بار آہستہ سے دبایا اس کا مطلب تھا ——

"پالا مار لیا ہے" ——

"دارا ب کی حالت اس وقت گو بہت سکون پذیر ہے مگر نبض اب بھی غیر منظم ہے، مس فیروزہ، اگر کہیں اس وقت وہ آنکھ کھول کر تم کو دیکھ لے اور پہچان لے تو میں نتائج کا ذمہ وار نہیں"۔

"وہ بالکل مُردہ معلوم ہوتا ہے" فیروزہ نے وہیمی آواز میں ترس سے کہا،

"بظاہر تو اصلیت میں بھی اس کے مُردہ ہو جانے میں کچھ زیادہ وقت باقی نہیں"۔ گنگولی نے اتنی ہی نیچی آواز سے کہا، فیروزہ اُٹھ کر قریب آنے لگی، لیکن گنگولی نے ہاتھ کے اشارے سے اُسے روک دیا، ممکن تھا کہ نزدیک آنے پر وہ پوڈر وغیرہ دیکھ لیتی،

"کیا وہ آنکھیں کھولتا ہے"۔

گنگولی نے میری نبض کو آہستہ سے دبایا،

میرے لیے اشارہ کافی تھا، آہستہ آہستہ، بہت ہی آہستہ، میں نے

کروٹ بدلنے کی کوشش کی، آدھی آدھی آنکھیں کھولیں، اور نہایت کمزور آواز میں کہا "فیروزہ، فیروزہ"

یہ آخری حربہ بہت موثر تھا، اور میں نے ایکٹنگ بھی بہت لاجواب کی تھی، فیروزہ کا رہا سہا استقلال بھی ختم ہوگیا اور اس نے کرسی پر بیٹھ کر دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا لیا، اور رونے لگی، جب کچھ آنسو تھمے تو اس نے کہا "میں اس تمام مصیبت اور تکلیف کی ذمہ دار ہوں، میں کس قدر قابل ملامت ہوں" اس وقت اس کی حالت مجھ سے دیکھی نہیں گئی، اور میں نے آہستہ آہستہ دوسری کروٹ لینا شروع کی، فیروزہ کھڑی ہوگئی، "وہ بیدار ہو رہا ہے" اس نے گھبرا کر کہا، میں نے اس دن سے پہلے کبھی ایسی درد انگیز اور سنجیدہ آواز اپنی عمر میں نہیں سنی تھی، جیسی اس وقت گنگولی کی ہوگئی۔ "ہاں وہ جاگ رہا ہے، بخدا مس فیروزہ، میرا گمان ہے کہ حالتِ بیہوشی میں بھی اُسے اس کا ادراک ہے کہ تم اس سے قریب ہو ــــ ابتدا سے اس کی یہی حالت ہے، تمھارا نام ہمیشہ اس کے ورد زبان رہتا ہے اور اسی طرح وہ مر جائے گا کہ تمھارا نام اس کی زبان پر ہوگا، اور روح پرواز کر رہی ہوگی"

"خدارا اسے بچالو، ڈاکٹر گنگولی اسے نہ مرنے دو"

"میں اپنی کسی امکانی کوشش سے دریغ نہیں کروں گا"

"میں جانتی ہوں، واقعی آپ ڈاکٹروں کی بھی کیا ہستی ہے، وہ مرد

کو موت سے بچانا'' اور ان کو نئی زندگی عطا کرنا' بالفاظ دیگر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا آپ خود اپنی رگوں کا خون مریض کی رگوں میں پہونچا رہے ہیں' کس قدر عظیم الشان ایثار ہے'' فیروزہ نے وقعت آمیز انداز سے کہا'

جب فیروزہ نے یہ الفاظ کہے' میں نے محسوس کیا کہ میری نبض پر رکھی ہوئی گنگولی کی انگلیاں ایک عجیب انداز سے مرتعش ہوئیں' اس سے زیادہ انتظار میرے امکان سے بھی باہر تھا' میں نے اپنا سر اس کی طرف پھیرا' آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں۔ اور بغور فیروزہ کی طرف دیکھا' اس کے بعد کراہا' گنگولی دوزانو میری پٹی کے پاس بیٹھ گیا'

''گنگولی' اختتام شاید بہت قریب ہے' میں .... میں اسے .... میں اُسے اِس .... میں اُسے اِس کمرے میں دیکھتا .... ہوں .... وہاں .... وہاں .... کھڑا ہوا .... وہاں کھڑا ہو ....'' میں نے نحیف ترین آواز سے کہا'___

بعد کو گنگولی نے بھی تسلیم کیا کہ یہ پارٹ میں نے خوب ادا کیا ___

جوں ہی میں خاموش ہوا' فیروزہ ایک سسکی لے کر اٹھی اور میرے بستر کی طرف بڑھی' میں نے خوف سے آنکھیں بند کر لیں' لیکن گنگولی نے اُسے روک دیا

___ ''مس فیروزہ اب جائیے' وہ بہت کمزور ہے''

''لیکن اس نے مجھے پہچان لیا'' اس نے مسرت بھری آواز میں

کہا، گنگولی نے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھا،

"خدا کا شکر ہے مس فیروزہ، تم نے اس کی جان بچا لی، اب وہ اچھا ہو جائے گا، تم نے ایک شخص کو موت کے منہ سے باہر نکال لیا"

"تو میں پھر اُسے دیکھنے کے لئے وقتاً فوقتاً آسکتی ہوں"

"ہاں، لیکن بہت تھوڑی دیر کے لئے"

"بخدا اختر، جب میں اس موقع کو یاد کرتا ہوں، اُس مجسمۂ حسن و خوبی کی اس وقت کی حرکات کا دھیان کرتا ہوں، اُس کی آواز کو تخیل میں لاتا ہوں، تو معلوم ہوتا ہے کہ ایک خواب تھا، جس کے حقیقتاً عالمِ وجود میں ظہور پذیر ہونے کا امکان ہی نہیں، —— دروازے سے گزرتے وقت میں نے اسے کہتے سنا،

"ڈاکٹر گنگولی، اب تک مرد میری نظر میں بہت حقیر چیز تھے، لیکن آج مجھے معلوم ہوا کہ مرد کیا چیز ہو سکتے ہیں، جب میں نے آپ کو دارا کے پلنگ کی پٹی کے پاس کھڑے ہوئے دیکھا، اس کو موت کے دروازوں سے بزور باہر لاتے ہوئے، تو میری نظر میں مرد فرشتوں سے برتر اور بالاتر ہو گئے"

دروازہ بند ہو گیا۔ اور تھوڑی دیر کے بعد گنگولی میرے پاس واپس آیا، اس [illegible] کھڑکیوں کے پردے اٹھا رہی تھیں، اور میں بستر کی برابر فرش

پر ایک پیر سے ناچ رہا تھا،

"اب وہ میری ہے،" میں نے انتہائے مسرت میں گنگولی سے کہا،

اُس نے سر ہلایا، مجھ میں غصے کا جذبہ پیدا ہوا، میں نے کہا،

"اِدھر دیکھو گنگولی، کیا اس کا مطلب میں یہ سمجھوں کہ اُس حسین اور شوخ لڑکی کو اتنے قریب اور اتنی آرائش سے دیکھ کر بھی تمھارے سرد اور مردہ دل میں کوئی گرمی اور روح نہیں پیدا ہوئی، کیا تم انسان نہیں ہو"

اُس نے اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا، اور چلا گیا ——— اس کے بعد بھی نرس کے بغیر معاملہ بگڑ گیا ہوتا، لیکن اُس نے کمال کر دیا، دن میں اس نے میرے چہرے، کمرے کی روشنی وغیرہ میں اس اس طرح تبدیلیاں کیں کہ فیروزہ کو کبھی شبہ تک نہیں ہوا، آخر کار فیروزہ کو ڈاکٹر نے اس کی اجازت دے دی کہ مجھ سے چپکے چپکے پانچ منٹ باتیں کر سکے، دو روز کے بعد اُس نے اپنے ہاتھ سے میرے لئے شوربہ تیار کیا ــ ایک تندرست نوجوان کے لئے اسی پر زندگی بسر کرنا تو ناممکن تھا، اس کے جانے کے بعد میں نے نرس کے ساتھ بیٹھ کر خوب مرغ اور کباب اڑائے لیکن وہ زمانہ اخترؔ، اس زمانے کی یاد ——— میں تم سے کیا کہوں، وہ شوخ اور حسین چہرہ، وہ غزالی آنکھیں، وہ اُس کا روز نیا لباس، اس کی آنکھوں کی وہ مسکراہٹ، جب اُسے پہلی بار اس کا اطمینان ہوا کہ میری صحت بہتر ہو رہی ہے، وہ میرا نرم نرم گدّوں پر ریشمی تکیوں پہ

سے لیٹے رہنا، اور اس کی نازک انگلیاں میرے بالوں میں کنگھی کرتی ہوئی اختر، وہ لطف، وہ لذت، وہ میرے بیان سے باہر ہے۔

"کتنے دن یہ ڈھونگ جاری رہا، واراب" میں نے پوچھا،

"دس دن، اختر، دس دن" اس نے آہستہ سے جواب دیا" مجھے اس سے دوبارہ شادی کی درخواست کرتے ڈر لگتا تھا کہ کہیں یہ سب خواب نہ ہو اور میں چونک پڑوں"

"اور گیارہویں دن تم نے اس سے درخواست کی، بخدا اور اب شادی کب ہے" میں نے اچھل کر کہا،

"ہاں گیارہویں دن میں اس سے درخواست کرنے والا تھا" واراب نے پھر اپنے پہلے کے مخصوص انداز میں قہقہے لگاتے ہوئے جواب دیا (قہ قہ قہ، ہا، ہا، ہا، قہ قہ قہ، ہا ہا، ہا قہ قہ قہ، ہا، ہا، ہا،) لیکن لیکن مشکل یہ آپڑی کہ وہ اس سے قبل ہی مسز گنگولی بن چکی تھی، اور میرا کل نرس سے عقد ہے، ہا، ہا، ہا، قہ قہ قہ،

خدا حافظ اختر، ۹½ بجے صبح کا وقت ہے، دیکھو آنا ضرور"

(ہا، ہا، ہا، قہ قہ قہ، ہا، ہا، ہا)

۵۔ طائرک بلند بام دانہ دوام سے گزر

(۱)

مقرر کی جادو بیانی پر، بھرے اجلاس عدالت میں تالیاں گونج کر جج کی ایک کڑی نظر پر خاموش ہو چکی تھیں، وکیل صفائی اپنی لمبی، پتلی، انگشت شہادت سے خوبصورت سیاہ چشم، سنہرے بالوں والی، اشکبار ملزمہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے جوری کے اراکین، کو یوں آخری بار مخاطب کر چکا تھا۔

"حضرات .... کیا ہم نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے، ثابت کرنا تو درکنار، وکیل سرکار نے صاف لفظوں میں ہم پر ایسا الزام عائد کرنے کی جرات بھی نہیں کی ہے، بہر حال اگر ہم نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہوتا تو بھی مقتول کے اور ہمارے اختلاف طبائع کی بنا پر ہمارا فعل جائز سمجھا جانے کا مستوجب تھا، اور اس کو ہم تعیش ذاتی کی ضرورت سے قتل کرنے میں حق بہ جانب متصور ہوتے لیکن .... ہمارا دامن خون مقتول سے پاک ہے۔"

اراکین جوری کو بھلا اس "فردوس گوش" طرز تخاطب اور "جنت نگاہ" حال ملزمہ کے بعد غور و خوض کے لئے اٹھنے کی بھی کیا ضرورت تھی، وہیں بیٹھے

بیٹھے انھوں نے بلا تامل بے گناہی کی رائے کا اعلان کر دیا، اور (   ) مادام مبیل مرے کو چند ہی ساعت بعد حاضرین کے غل غپاڑے، اور کیمروں کی کھٹ کھٹ کے ایک طوفان بے تمیزی میں برأت کا حکم سنا دیا گیا۔ مادام بہت متاثر، بہت متشکر، بہت خستہ حال، ـــــ مگر بایں ہمہ سامان آرایش کا بٹوا کھولے، آئینے کی مدد سے پوڈر لگانے میں مصروف، غازہ ملنے کو نہ بھولی ہوئی، اپنے فاضل وکیل کے بازو کا سہارا لیئے، اجلاس سے باہر آئیں، روانگی سے قبل "انجمن اشخاص بری شدہ" کے معتمد نے منجانب انجمن، مادام کی خدمت میں بطور ہدیہ تبریک، سرخ گلاب کے پھولوں کا ایک بڑا گچھا پیش کیا، اور اخباروں کے تین نمایندوں نے محبت، روحانیات، قومی مجلس دفاع، مستورات کے سائے کی اونچائی، شادی کی مناسب ترین عمر، ضبط تولید، بین الاقوامی صورت حال، ان سب مسائل پر مادام کی رائے دریافت کر کے نوٹ کی، ـــ

مادام اپنے دولت کدے پر رونق افروز ہوئیں تو اُن کے خدمتگار نے بہ چشم تر اُن کے حضور میں جوہی کے گلہائے ابیض کا ایک گلدستہ گذرانا، اور ان کی خادمہ خوشی سے سسکیاں لیتی ہوئی اُن سے لپٹ گئی، ان تمام اخلاص کے مظاہروں سے فراغت ہوئی تو مادام کی خادمہ نے مادام کو ایک ملاقاتی کارڈ دیا، ـــــ

کامتے دی شیولیر ـــــ ۵۴، رو بلدر، پیرس

۱۱ سینٹ جیمس اسٹریٹ لندن

"یہ کون صاحب ہیں" مادام نے تعجب سے بھویں چڑھا کر پوچھا،

"یہ ایک صاحب ہیں مادام، جو ڈرائنگ روم میں بیٹھے تین گھنٹے سے مادام کا انتظار کر رہے ہیں"

"یہ کیا چاہتے ہیں، مجھ سے اخبار کے لئے بیان لینا"

"مادام میں نہیں کہہ سکتی، لیکن وہ ایک بہت خوش اخلاق انسان ہیں"

مادام نے پہلے حجرہ آرائش و زیبائش میں جا کر کنگھی چوٹی کی، پھر ڈرائنگ روم میں قدم رنجہ فرمایا، کامتے سرو قد تعظیم کو کھڑے ہو گئے، خوش قامت خوش پوشاک، سرخ سفید رنگ، لاجوردی آنکھیں، کامتے سر سے پاتک رعنائی ہی رعنائی تھے، انھوں نے پہلے مناسب لفظوں میں مادام کو ان کی براءت پر مبارکباد دی، اور عرصۂ سماعت مقدمہ کی تکالیف اور الجھنوں پر سخت تاسف کا اظہار کیا، ———

"آپ کی نوازش و عنایت سے میں بہت متاثر ہوئی، مجھ کو افسوس ہے کہ میں نے آپ جیسے شخص کو، بدگمانی سے پہلے اخبار کا نمایندہ باور کیا تھا"

"وہ اخبار کا نمایندہ، میں اور عامۃ الناس کی پوشیدہ معصیتوں کی پردہ داری کو، بطور ذریعۂ معاش اختیار کروں، نہیں، نہیں، مادام ——— مجھ سے یہ بالکل بعید ہے میرا تعلق ایک معزز پرانے فرانسیسی خاندان امرا سے ہے،

میں نیم امریکی، نیم فرانسیسی ہوں، اور میری عمر چھتیس ۳۶ سال ہے"

"آپ چھتیس ۳۶ سے کہیں کم معلوم ہوتے ہیں"

"یہ میرے کھلی ہوا میں رہنے کا اثر ہے، شہر سے بائیس ۲۲ میل پر میرا خوبصورت مکان اور میرا علاقہ ہے، اور خاص شہر طولوں میں میری شراب کی اور نائیٹر کی فیکٹری ہے جو گل ولالہ کی کاشت میں کھاد کے طور پر استعمال ہوتا ہے میری سالانہ آمدنی آٹھ کروڑ فرانک ہے جو امریکی سکے میں، مساوی ہے چالیس لاکھ ڈالر کے".................. اس موقعہ پر کامتے کچھ جھینپ سے گئے، اور دو ایک بار کبوں کو حرکت دینے کے باوجود اُن کے منہ سے کوئی آواز نہ نکلی، ۔

"بہت خوب،" مادام نے ایسے انداز اور ایسی آواز میں کہا جیسے وہ آگے سننے کی متمنی ہیں۔ کامتے کے خوبصورت چہرے پر پہلے کشمکش ذہنی کے آثار پیدا ہوے، پھر جیسے کوئی پیراک، غوطہ لگاتے وقت خود کو سنبھالتا ہے، سنبھل کر انھوں نے اپنی گفتگو میں یہ اضافہ کیا۔

"میں یہ سب امور اس لئے بالتفصیل بیان کر رہا ہوں کہ میں یہاں اس وقت آپ کو پیام عقد دینے کی غرض سے حاضر ہوا ہوں"

"موسیو! آپ کے طریقہ، کار پر مجھے غصہ سے زیادہ ہنسی آتی ہے"

"آپ کو نہ غصہ آنا چاہئے نہ ہنسی، مادام۔ میرا پیام مخلصانہ اور سنجیدہ ہے، آج کی مصروفیت اور حسین بعض کے تاثرات محو ہونے کے بعد

جب آپ کو اس پر ٹھنڈے دل سے غور کرنے کا موقع ملے گا تو مجھے یقین واثق ہے کہ آپ میرے پیام کو مسترد نہ فرمائینگی"

"لیکن موسیو، آپ کا پیام بہت اچانک، بالکل غیر متوقعہ، اور بےحد خلاف رواج معینہ ہے، ابھی میری آپ کی شناسائی کو چند لمحے بھی تو نہیں ہوئے"

"آپ ٹھیک فرماتی ہیں، لیکن آپ غلطی پر ہیں، آپ کو مجھ سے واقف ہوئے ضرور صرف چند ہی لمحے ہوئے ہیں، مگر میں تو مادام پر اُسی دن سے فریفتہ ہوں جب مادام عدالت کے روبرو بار اوّل پیش ہوئیں، مادام میرے پیام عقد پر غور فرمائیں، اور پھر دو چار دن کے بعد مجھ کو قطعی جواب دیں، لیکن اتنا اسی وقت مجھے بتا دیں کہ مادام میرے پیام کو ابھی سے یکسر ناموزوں اور ناممکن تو نہیں قرار دیتی ہیں"

"ہرگز نہیں، موسیو، ہرگز نہیں، بلکہ اس کے بالکل برعکس، چونکہ ہم دونوں اب زیادہ بے تکلفی سے گفتگو کر رہے ہیں، اس لئے کیا میں یہ دریافت کرنے کی جرات کر سکتی ہوں کہ آپ کیوں مجھ جیسی بدنام عورت کو اپنے دامن سے منسلک کرنا چاہتے ہیں"

"میں مادام سے صاف صاف عرض کرتا ہوں۔ بہت صاف صاف .... اس لئے مادام کہ مادام اپنے سابقہ شوہر کی قاتل ہیں"

"اوہ" مادام نے حیرت، حسرت اور حدّت سے کہا،

"میں جانتا ہوں کہ آپ کے فاضل وکیل نے اراکین جوری کے ذہن میں آپ کی بے جرمی کا تصور پیدا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، لیکن مادام تو واقف ہیں کہ مادام کے حسن، مادام کے اشکوں اور مادام کے سابقہ شوہر کی اختلاف مزاجی کو مادام کی برأت میں جس قدر دخل ہے، مادام کے مقدمہ کی شہادت کو نہیں، مخلصین کے مابین کوئی چیز راز نہیں رہنا چاہئے، مادام کے سابقہ شوہر کے قتل کی حد تک خوش قسمتی سے میں اور مادام ہم خیال ہیں، ہم دونوں کو قاتل کی تلاش میں کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں۔"

"معاف کیجئے گا موسیو ...." مادام نے ترشروئی سے شروع کیا تھا کہ

"مادام، مادام، پیاری مادام، براہ کرم اپنی صفائی کرنے کی کوشش نہ فرمائیے، مجھ کو آپ سے جو اس قدر زیادہ انس ہے، وہ محض اسی جرم کے اثبات کے باعث، صرف اس لئے کہ آپ اپنے سابقہ شوہر کی قاتل ہیں (جس کو عدالت نے معاف کیا اور بخش دیا ہے) اور اس ڈرامے کا پردہ تو ہمارے عقد کی ندرت کو فروزاں کر دے گا، عدالتوں کا مفروضہ ہے کہ مرد صرف بے داغ عورت سے دل لگا سکتے ہیں، لیکن یہ ان کی بھول ہے، میں دو ماہ سے دن و رات کے ہر ہر پل میں، مادام کی یاد پر جیا ہوں۔ میں نے اپنی خیالی عشرت گاہ میں خود کو مادام سے وابستہ عقد متصور کیا ہے، ہر شب کو میں بستر پر مادام کے لئے جگہ چھوڑ کر لیٹا ہوں، ہر صبح کو میں نے

مادام کا غسل خانے کے باہر انتظار کیا ہے، اب مادام کی مہربانی سے میرا خواب شرمندۂ تعبیر ہوگا، راتوں کو بستر پر دراز ہوتے وقت ایک متوقعہ ڈرامے کا جسم میں جھرجھری پیدا کرنے والا تصور، مادام کے نازک ننھے اور نرم ہاتھوں سے میرے گلے کے آہستہ آہستہ، بتدریج گھٹنے کا تخیل پستول کی گولی کے دماغ میں رہ جانے کا وہ ناقابل بیان ادراک، جوں جوں مادام اس کی نال کو میری پیشانی کے قریب تر لاتی جائیں ....

پھر میری کنپٹی پر خون، یا گلے کی جلد پر سیاہ نشانات، ....

یہ سب متوقعہ تصورات میری روح کو بیدار کرتے ہیں، اور میرے اندر مسرت تام و بہجت دوام کے ایک ایسے ناقابل بیان جذبے کی آفرینش کو میں مکرر، زیادہ اصرار سے، پھر آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ جسقدر جلد ہو سکے، مللتہ، میری ہو جائیے، اور ...."

مادام میبل مرے کامتے کی اس عجیب و غریب تقریر پر لاجواب ہوگئیں اور دیر تک نگاہ تحیّر و تردّد سے کامتے کو دیکھا کیں

"مگر موسیو، میں احتجاج کرتی ہوں، میں نے اپنے سابقہ شوہر کو قتل نہیں کیا تھا، میں صرف بدبختی کی کشتہ ہوں"

"صحیح، مادام صحیح، آپ تو یہی فرمائینگی، آپ نے اپنے وکیل کو بھی یہی باور کرایا تھا، مگر مادام اب فیصلے کے بعد ہمارے آپ کے درمیان اس بہانے بازی اور مذاق کے باقی رہنے کی ضرورت نہیں، میں مادام

کو بہ قسم یقین دلاتا ہوں کہ مادام کے جرم سے میری نظروں میں مادام کی لکشی میں چار چاند لگ گئے ہیں، اور جب وقت تک مادام مجھ سے ہاں نہ کہہ دیں گی مجھے چین نہ آئے گا''

مادام مرسے اور کامتے دی شیولیر کو رشتۂ مناکحت میں منسلک ہوئے سال بھر گزر چکا ہے، اس عرصے میں مادام اور کامتے دونوں نے مسرت وعیش کے جام پر جام لنڈھائے ہیں، مادام کو کامتے کی دولت نے ہر آرام وآسائش سے بے نیاز کر رکھا ہے، اور کامتے کو برطانوی سفارت خانے کے اٹیچی اکیپٹن فلیپ مرسے کے قاتل کی ہم آغوشی اور پہلونشینی کی ساری لذتیں حاصل ہیں، اپنے نزدیک وہ گویا ہر اس لطف سے محظوظ ہو رہے ہیں، جو ''جرائم پیشگی کے اوتاروں'' ہی کو حاصل ہو سکتے ہیں،

ایک روز صبح کا اخبار کھولنے پر مادام کی نظر اس اعلان پر پڑی۔

''یہ مشکل ہی کوئی شخص ایسا ملے گا، جس کو ابھی مادام میبل مرسے کے مقدمے کے حیرت انگیز اور ولولہ خیز واقعات بھولے ہوں، جوری نے مادام کی برأت کی رائے دی تھی، اور مادام نے اپنے وکیل اور عدالت کے جج دونوں کے روبرو اس پر آخر تک اصرار کیا تھا کہ وہ بے گناہ ہیں، اور ان کے شوہر کو کسی نامعلوم شخص نے گولی مار کر ہلاک کیا ہے،

مادام میبل مرے جواب کا ڈنس دی شولیہ ہیں، اپنے اس ادعا میں واقعی حق بہ جانب نہیں ہو۔ بہ برگنڈی کا ایک عادی مجرم، جس کو ڈاکے کے سلسلہ میں کل مارسیل میں گرفتار کیا گیا، اس نے مجسٹریٹ کے روبرو اقبال کیا ہے کہ برطانوی سفارت خانے کے ملحق واقعۂ قتل کا اصل مجرم وہی ہے اور اس نے کھلی کھڑکی میں سے پستول چلا کر اپنی بیوی کی آبروریزی کا انتقام مقتول سے لیا تھا۔"

اعلان پڑھ کر مادام کی مسرت کی انتہا نہ رہی، اُن کو افسوس ہوا کاش اس وقت کامتے کاروبار کے سلسلے میں لندن میں ہونے کے بجائے گھر پر موجود ہوتے اور اُن کی بے پایاں مسرت میں برابر کے شریک ہو سکتے۔ ظاہر ہے ایسی شکل میں صرف یہی ممکن تھا کہ اس اعلان کا تراشہ ہوائی ڈاک کے ذریعے، فی الفور لندن، ہوٹل میجسٹک، سوٹ ۲۳ کے پتے پر روانہ کر دیا جائے، مادام نے یہی کیا۔

چوبیس گھنٹے کے اندر مادام کو لندن سے ایک تار ملا، دھڑکتے دل اور رعشہ دار ہاتھوں سے مادام نے لفافہ کھول کر اس کو پڑھا اور گر پڑیں۔

"افسوس کے ساتھ میں تم کو اطلاع دیتا ہے کہ مارسیل کی خبر نے میرا دل توڑ دیا، اور میری ہر توقع مٹا دی، تم نے مجھ کو حقیقت سے بے خبر رکھ کر دھوکا دیا، میں نے ابھی ابھی اپنے مشیر قانونی کو ہدایت کی ہے کہ طلاق کی کارروائی شروع کر دی جائے۔۔۔ الوداع ۔ مارسیل۔"

دوسرے دن مادام کا جنازہ بڑی دھوم سے اُٹھا۔

(ترجمہ)

دوسرا حصّہ

The worst Book that I have ever seen
[signature]
29-9-48

۱ ـــــــ ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ،

۲ ـــــــ کام یاروں کا بقدرِ لب و دنداں نکلا،

۳ ـــــــ اُن کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں،

۴ ـــــــ عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی،

۵ ـــــــ عشق ازیں بسیار کردست و کند،

۶ ـــــــ نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی،

۷ ـــــــ اب عناصر میں اعتدال کہاں،

۸ ـــــــ سناتا جا رہا ہے جس کو جتنا یاد ہوتا ہے،

۹ ـــــــ جو بھی گنہگار ہے، اپنا گنہگار ہے،

۱۰ ـــــــ یاد رکھ اے دل کہ فطرت ہے سراپا انتقام،

ونکٹا چلم مر چکا تھا، برچھا سینے کے آر پار، رسوئی میں اس کی نعش ملی تھی، اور قتل اس کا ثبوت تھا کہ کمسن بچوں کا خون پینے کی جو روایت اس سے منسوب تھی وہ صحیح ہے، بھدروا اور اس کے آس پاس کے لوگوں کی کم سے کم یہی رائے تھی، ان کا عقیدہ تھا کہ کالی مائی کے مندر کے گرو کی بد دعا کے بعد سے ونکٹا چلم، چاندنی راتوں میں بھیڑیئے کے بھیس میں، سوتے گھروں میں گھس کر، شیر خوار بچوں کی شہ رگ سے خون پی جاتا ہے۔

جیلخانے کے اداس اور اندھیرے حجرے میں سنکھا دت مقتول کا تبنتی بیٹا اور اقبالی مجرم، موت کے انتظار میں بیٹھا تھا، حجرے کے باہر برآمدے کے پار صحن میں سے بڑھیوں کے اوزاروں کی آواز آ رہی تھی، پھانسی کا تختہ زیر تیاری تھا۔

بڑی سی موٹی کنجی کی کھڑ کھڑ بڑ بڑ کے بعد قفل کھلا اور حجرے کے دروازے میں سے راگھو چاری، عیسائی برہمن، ڈاکٹر اندر داخل ہوا، سنکھا دت نے آنکھ بھی نہ اٹھائی، بیٹھک تک نہیں بدلی،

جب ڈاکٹر نے پاس پہنچکر اُس کے شانے پر ہاتھ رکھا،

"نکہت، کیوں مار ڈالا تم نے اس کو" ـــــــ تم پر وہ بہت مہربان تھا، بے انتہا چاہتا تھا"

نکہت نے گردن اٹھا کر اداس آنکھوں سے پوچھنے والے کو دیکھا۔

"میں نے اس کو قتل کیا، اس لئے کہ مجھ پر یہ حق تھا، بھارت والوں کا! اور اس لئے کہ باپو کا مرنا اچھا تھا بہتر تھا جیتے رہنے سے، اب ان کا جیون نشانت ہے، اور گروکی ... سے، محفوظ ہیں"

"تم کو بھی اس کا یقین ہے کہ وہ شیر خوار بچوں کا خون چوس لیتا تھا تمھارے پاس اس امر کا کوئی ثبوت ہے؟"

نکہت نے اثبات میں سر ہلایا، اس کی آواز میں درد کے ساتھ جوش کی کیفیت بھی پیدا ہو گئی،

"میں نے ان روایتوں کو جو باپو سے منسوب کی جاتی تھیں باور کرنے سے ہمیشہ انکار کیا، ـــــــ ان کے قتل کی رات سے ماقبل رات تک ـــــــ میں کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ دروازے کے پٹ کھلے اور میری نظروں کے سامنے ایک بھورے، بڑے بھیڑیئے کا چہرا اور گردن تھی آنکھیں سبزی مائل، خونخواری کی ہوس سے روشن، زبان ہونٹوں سے باہر لٹکی ہوئی اور بڑے بڑے پیلے دانت نکلے ہوئے ـــــــ لمحے بھر کو خوف سے میں بُت بنا رہا، پھر کونے میں رکھی ہوئی لکڑی سے میں نے اس کی سیدھی آنکھ پر ایک ضرب رسید کی، ایک خوفناک چیخ اس نے ماری، خون

اچھل کر اس کی ناک اور منہ تک آیا اور میرے دوسری ضرب لگانے سے پہلے وہ مڑ کر اندھیرے میں گم ہو گیا ۔۔۔۔۔۔ رات بھر میں نے جاگ کر، ٹہل کر کاٹی، تڑکے میں نہا کر رسوئی میں گیا، بابو اپنے چوکے میں بیٹھے تھے، ان کی داہنی آنکھ پر پٹی بندھی تھی، خون اس وقت تک رس رہا تھا ۔۔۔۔۔۔ میں نے بر پچھے سے ان کو بھونک دیا"

ڈاکٹر کے چہرے پر سفیدی تھی، اس کا جسم کانپ رہا تھا، ہاتھ لرز رہے تھے، "سنکھٹ" اس نے تھرتھراتی آواز سے کہا "سنکھٹ میں اور وہ اُس دن منہ اندھیرے، چھپ کر گنگو بھیل کی تیمارداری کے لیے نکلے تھے، ایک بڑے، بھورے، جنگلی کتے نے ہم پر حملہ کیا، میں بچ گیا، اس پر پنجہ پڑا، میرے پلٹتے پلٹتے کتا جنگل میں بھاگ گیا، میں نے وینکٹ کی جیسے تیسے بن پڑا مرہم پٹی کی، اور اکیلا گنگو کے ہاں چلا گیا، وہ گھر واپس آ گیا، خون برابر دھیرے دھیرے رس رہا تھا، اگر اُس وقت کسی پر اس واقعے کا اظہار کرنا نامناسب تھا"

"کہاں لگا تھا کتے کا پنجہ"

"صرف سیدھی آنکھ زخمی ہوئی تھی، باقی چہرا محفوظ تھا"

ڈاکٹر چپ ہوا تو قید خانے کے حجرے میں کامل سکوت تھا، سنگھٹ کی سسکیاں، البتہ اس کو توڑ رہی تھیں۔

ہے - کام یاروں کا بقدر لب و دنداں نکلا

اُما کی شکل تو معمولی تھی مگر گلا نور کا پایا تھا، آواز میں بلا کا درد اور غضب کی کشش تھی، جس شہر میں "ماڈرن میوزک کمپنی" کے پوسٹر لگتے، لوگ اُما کو سننے کے لئے ٹوٹ پڑتے، ظاہری وضع قطع کو آواز کے معیار پر لانے کے لئے اُما، لباس اور زیور پر معمولی ایکٹرسوں سے کہیں زیادہ توجہ، وقت اور رقم خرچ کرتی تھی، اس کے جڑاؤ اور جواہرات کے زیوروں کی شہرت کچھ اس سے کم نہ تھی،

کمپنی بمبئی آئی تو اُما "تاج" کے ایک ہال میں ٹھہری، جھلملاتی پوشاک اور جگمگاتے زیور پہن کر، چھ بجے وہ رنگیل جاتی، اور سوا بارہ بجے ہوٹل کی [illegible] میں واپس آجاتی، ——— ایک رات واپسی میں اس کی موٹر کو اُچکوں نے روکنے کی کوشش کی، جب سے اُما نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ سادے لباس میں زیور پہنے بغیر تھیٹر آتی جاتی، قیمتی پوشاک اور زیور، روزانہ خفیہ پولیس کا آدمی موٹر سائیکل پر لاتا اور لے جاتا، —

چھ بج رہے تھے، پہلے شو کے شائقین کے اژدحام سے رنگیل کی وسعتیں تنگ تھیں، اُما اپنے "ملبوس کدے" کے اندر زیور و پوشاک والے کے انتظار

میں ابھی غازے اور پوڈر کی مدد سے محوِ آرایش تھی دفعتاً چھت سے کسی شیشے کی ٹوٹنے کی آواز ہوئی، اور پھر تیزی سے خادمہ کو طلب کرنے کی گھنٹی بجی۔

"وہ تاج سے ٹیلیفون ملاؤ، جلد ملاؤ" ــــــــ اُما نے مضطربانہ انداز اور متردد آواز میں، مگر رُک رُک کر کہا ــــــــ

اسسٹنٹ منیجر سے کہا گیا، منیجر کو فوراً فون پر بھیجو، مس اُما بلاتی ہیں، منیجر معزز و مشہور مہمان کی خاطر بھاگا ہوا آیا، مس اُما نے پہلے اس کو قسمیں دے کر راز داری کا حلف لیا، پھر کچھ ہدایتیں کیں ــــــــ

"ہاں، ہاں مس اُما، آپ بالکل اطمینان رکھیے، آپ جیسا حکم دیں گی ویسا ہی ہوگا، کانوں کان کسی کو خبر نہ ہو گی"، جی ہاں، خاص آدمی کے ذریعے ابھی بھجواتا ہوں میں، ابھی منٹ بھر بھی نہیں لگے گا"

اور منٹ بھر بعد خاص آدمی، ہوٹل کی دوسری موٹر سائیکل پر تھیٹر کی جانب اڑا جا رہا تھا، پ ۶ کے سات ہوگئے اور پردہ کسی صورت سے نہ اٹھا، نہ شائقین کو مس اُما کے درشن ہوئے ــ سوا سات بجے "ماڈرن میوزک کمپنی" کے منیجر نے اسٹیج پر آ کر مس اُما کی اچانک ناسازیٔ مزاج کے عذر سے مجمع کو معذرت کے بعد رخصت کر دیا، اس کے بعد پردے کے پیچھے ایک کمیٹی منعقد ہوئی، کمپنی کے منیجر صاحب تھے، ان کے بازو ایک پولیس کے غفانہ دار بیٹھے صدرنشینی کر رہے تھے، اور ان کے مقابل میں موٹر سائیکل پر سواری کرنے کی پوشاک میں ملبوس "تاج" کا بِلا اور پین،

لگائے ایک نوعمر شخص، جس کی کنپٹی کے نیچے بسطخ کے انڈے سے بڑا گومڑا تھا، سر پکڑے بیٹھا تھا، مس ؟ ابھی اپنے زرق برق ملبوس اور زیورات کی تمام رعنائیوں اور رنگینیوں کے ساتھ حاصل محفل ضرور تھیں مگر رونق محفل نہیں، بہ مشکل ہی بات کرتیں اور کرتیں بھی تو بہت رک رک کر، لکنت کے ساتھ، اور ہر بار ٹھوڑی کو ہتھیلی سے سہارا دے کر، ——

ٹھیک اسی وقت تھیٹر سے دس میل دور پر، شہر کے مخالف حصے میں امپیریل ہوٹل کے ایک بند بالائی کمرے کے اندر، دو اُچکے درمیانی میز کے ادھر اُدھر بیٹھے، سناٹے کے عالم میں میز پر رکھے ہوئے، کھلے ہینڈ بیگ اور اس کے اندر رکھے مخملی ڈبے کو دیکھ دیکھ کر، دانت پیس رہے تھے، اس مخملی ڈبے کے بیچوں بیچ میں ریشمی روئی کی ایک نازک تہہ پر مصنوعی دانتوں کا نہایت مکمل، حسین، اور پُر ضیا سٹ رکھا تھا، ——

وہ دانت جن کے ساتھ کا دوسرا سٹ، سارے ہندوستان میں ہر جگہ ہزاروں بار، شائقین رقص و سرود کی نظروں میں خیرہ کر چکا تھا،

۵۔ ان کی طرف سے آپ لکھے خط جواب میں

آزاد دل ہی دل میں مسکرایا۔ "تمام جزئیات پر میں غور کر چکا ہوں قول پروف ہے معاملہ فول پروف، بس الطاف کی شانِ تحریر کی کامیابی سے نقل کر لینا ہے اور مار لی یاروں نے بازی۔ کسی حاشیہ کے خیال میں بھی نہ آئے گا کہ اس کی موت غیر طبعی ہے"

....

"عرصہ سے وہ دائم المرض ہے ہی مستقل بیمار، جب دیکھو علیل جب پوچھو مریض، آج دست آ رہے ہیں، کل گردے میں کسک ہے، پرسوں پھیپھڑوں پر ہلکا سا حملہ ہو گیا، اور پھر ہزاروں بار ہزاروں لوگوں کے سامنے اس نے یہ دھمکی دی ہے کہ خودکشی کرے گا، ان سننے والوں کی گواہی کی بھی توقعت ہوگی"

اس کا صرف آزاد ہی کو اندازہ تھا کہ الطاف کی یہ دھمکیاں گیدڑ بھبکیوں کے سوا کچھ نہیں، اور اس میں اتنی جرأت ہی نہیں کہ اپنے اوپر وار کر سکے، اس قسم کی باتیں الطاف دراصل اپنے تئیں "قتیلِ جفا" اور "شہیدِ ستم" ظاہر کرنے اور آزاد کو طعنے دینے کے لئے کیا کرتا تھا "اگر میں مر جاؤں تو آزاد کی غربت چشم زدن میں شہزادگی میں بدل جائے، کیوں کہ آزاد اچھا

ہے نا ، ساری کلفت دور ہو جائے گی ، جائداد اور روپیہ سب تمھارے ہی حصے میں آئے ،،

آزاد کو روپیے کی شدید ضرورت تھی ، اتنی شدید کہ وہ " گناہ عظیم " قتل کے ارتکاب کی تیاری کر رہا تھا ، تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں ، صرف ایک امر باقی تھا ، الطاف کے آخری مکتوب کی تدوین اور اسی کی شان تحریر میں اس کا اندراج ، قطعیت اُس خط کے مضمون میں لازمی تھی ، مگر عبارت میں بے ربطی خیالات کا اظہار یا ایہام کا بھی ضروری تھا ، کیونکہ الطاف کو جاننے والے جانتے تھے کہ الطاف انتہا پسند مزاج کا شخص نہیں ، چند سطریں اداسی مضمون کی ، آنسوؤں کے دھبے ، دو ایک مقامات پر ، تاکہ دیکھنے والے خیال کریں لکھتے وقت کاتب بہت متاثر تھا ، ایک آدھ مرادف کی تکرار بس ،

آزاد نے ایک مکتوب مرتب کیا ، اس کا کچھ لمحے مطالعہ کیا ، پھر اس کو آتشدان کی نذر کر دیا " اوں ہونھ ، یوں کام نہ چلیگا " اس نے زیر لب کہا " اس خط میں الطاف کی انفرادیت منعکس نہیں ، پھر کوشش کرنا چاہیے " اس نے سوچ سوچ کر ایک دوسرا ، اب کے مختصر ، مکتوب تیار کیا ، " ہونھ " اس کو کئی بار پڑھ کر اس نے کہا " یہ ٹھیک ہے ، الطاف کے دوست احباب جو اس سے واقف ہیں اور جن کو اطمینان دلانا اس ساری کھتا کا مرکزی مقصد ہے ، وہ اسی قسم کے خط کی اس سے توقع کریں گے ، اگر

الطاف خودکشی کی ٹھانے، ان معاملات میں ذرا بھی کسر رہ جائے تو پھانسی کا تختہ ہی اول منزل ہے، بیچ میں کچھ نہیں" ——————

آخری بار پھر اس نے اپنے لکھے کو پڑھا،

"میں اپنی بیکار زندگی سے عاجز ہوں، اور قصہ تمام کرتا ہوں، خدا حافظ، مجھے یاد رکھنے اور یاد کرنے کی ضرورت نہیں، الوداع"

آزاد مسکرایا، اور سرج کی شیروانی کی اندرونی جیب میں اس خط کو رکھ کر پُرعزم قدموں سے "الطاف منیشن" کی طرف چل دیا،

ایک کام ابھی باقی تھا، الطاف کی شان تحریر میں اس خط کی نقل کرنا، اور اس کے لئے ضروری تھا پہلے الطاف کی شان تحریر کا کوئی ایسا نمونہ حاصل کر لیا جائے جس میں اس مکتوب کے سب نہ سہی بیشتر الفاظ پائے جائیں، —————— کوئی مشکل نہ تھا یہ کام، الطاف کی لائبریری اکثر غیر مقفل رہتی تھی اور الطاف جیسے لا ابالی شخص سے یہ کچھ بعید نہ تھا کہ میز پر ڈاک میں بھیجے جانے والے خط ہفتوں پڑے رہیں" آزاد نے طبیعت میں ایک جوش، ایک فخر، ایک گرمی سی محسوس کی، مگر وہ ہیش کا صحیح ادراک نہ کر سکے دھندلا ہو گیا، سڑک پر پاس ہو لینے والوں کی آوازیں دور سے آتی معلوم ہونے لگیں، اور غیر ارادی طور پر خود بخود اس کی چال تیز ہو گئی۔

کار ونزا نے صرف دس منٹ میں تصفیہ کر دیا "خودکشی بعالم فتور طبیعت"

——— اس نے اپنی رپورٹ میں لکھا "جب نعش فوجی موٹر لاری کے نیچے سے نکالی گئی، شیروانی کی اندرونی جیب سے ایک پرچہ نکلا، اس پر دستخط نہیں ہیں، مگر یہ مسلمہ ہے کہ وہ متوفی کے قلم کا ہے، ہم یہ باور کرنے کو تیار نہیں کہ یہ محض اتفاق ہے نہ بالعموم روزمرہ کی زندگی میں ایسا ہوتا ہے کہ صحیح العقل لوگ اس قسم کے مکتوب جیبوں میں رکھ کر گھروں کے باہر نکلیں، اور یہ ظاہر بالکل خوشی خوشی موٹر لاریوں کی زد میں آجائیں ایسا قیاس کرنا عام قرائن کائنات کے متغائر ہے"

؎ عمل سے زندگی بنتی ہے جنّت بھی جہنّم بھی

منظر کو بچپن سے بڑا شاعر بننے کا خبط تھا، چھبیس سال کا خوش وضع، خوش قطع جوان، — نجس سے نجس دماغ میں بھی اس کی نسبت بدگمانی پیدا ہونا مشکل تھا ———— جودت طباعی سے قیافہ روشن، مطالعہ اور معلومات بے پناہ ———— بڑا شاعر بننے کی دھن تھی، نو سال کی عمر میں اساتذہ، غیر اساتذہ، سب کے دواوین و کلیات چاٹ لئے تھے، صبح و شام یہی مشغلہ تھا، اس کی غریب ماں دن رات جھینکتی تھی، لیکن منظر کو اگر داغ کی بدترین غزل کا مصرعہ بھی ہوتا تو اس کو رٹنے کے لئے وہ رات رات بھر جاگ کر گزار دیتا، —— نفسیاتی مطالعے کے اغراض کے لئے اس کی ذات بڑا اچھا میدان تھی، ——— ماں کے مرنے پہ کوئی سہارا نہ رہا، پیٹ پالنے کو محنت کرنیکی ضرورت تھی، اس میں دقت بھی لگتا اور جسم بھی تھکتا جسم تھکتا تو راتوں کو نیند غلبہ کرتی اور منظر کو راتیں "کلام" کے مطالعے کے لئے درکار تھیں، وہ ایک جیب کترے کا اسسٹنٹ ہو گیا، باپ اُس کا پہلی جنگ میں کام آ چکا تھا، بے یاری میں ماں کی موت نے بدی کی خفتہ صلاحیتوں کو بیدار کر دیا، اور اس کا ذہنی زاویہ یہ ہو گیا کہ دنیا نے اس کو کچھ نہیں بخشا، بلکہ اس سے

سب کچھ لے لیا، اس لئے اب جیسے بھی بن پڑے دنیا سے اپنا حصہ وصول کرے مگر ——— بڑا شاعر ضرور بنے۔

"میں حیات اور اس کی پہنائیوں، گہرائیوں کا قریب سے مطالعہ کروں گا"۔ شراب پینے لگا، جوے میں شریک ہونے لگا، عورتوں میں پھنس گیا، ان سب شغلوں کے لیے روپئے کی حاجت ہوئی، اٹھائی گیری، اچکاپن، سب شروع کر دیئے، خیرات سے البتہ نفرت رہی، دن بھر ان مشغلوں میں گزارتا، رات ایک نہایت گندی سرائے کے تنگ و تاریک کمرے میں بڑی اذیت سے کاٹتا، آمدنی کا بڑا حصہ شعرا کا کلام حاصل کرنے رسایل فراہم کرنے، عروض اور شاعر ساز کتب کی بہم رسانی میں اٹھ جاتا، اپنے لحد نما حجرے میں وہ قابل تحسین عزم و استقامت کے ساتھ اس نظام العمل کی پابندی کرتا، بس ایک ہی دھن شروع سے تھی، شعر کے جملہ رموز و اسرار سے کامل باخبری اور ان پر مکمل عبور حاصل کرنا، "جب تک کامل نہ ہو جاؤں، ایک نظم، ایک غزل، ایک شعر یا ایک مصرعہ نہ کہوں گا، ایک دم سے ایسی ایک نظم مرتب کر کے شائع کروں گا کہ جوش اور قاضی نذر الاسلام کے چھکے چھوٹ جائیں، اقبال و ٹیگور کے نام کو لوگ بھلا دیں، یا ایسی غزل کہہ دوں گا کہ میر و غالب کی روحیں تڑپ اٹھیں، اصغر و فانی لحد میں کروٹیں لینے لگیں، فراق اور جگر کو پسینہ آجائے"۔ ادھر ٹریننگ جاری رہی، ادھر روزی کمانے کے مشغلے، چھبیسویں سال اس نے محسوس کیا کہ اب

شعر کہنے اور بڑا شاعر بننے کے لیے تربیت مکمل ہو چکی" "چھ سال سے کائنات اور سماج کے تمام زخموں اور ناسوروں' سارے درد' دکھ' سب گوشوں اور پہلوؤں کا' ان کی کاملیت کے عالم میں' میں مطالعہ کرتا آیا ہوں مسلسل پندرہ سال تک فن شعر کے جملہ رموز و اسرار سے واقفیت حاصل کی ہے' ——— میرا شعور بیداری میں اکمل ہے' اور میرا وجدان احساس میں مکمل' میری نگاہیں دشت و معدن ہی نہیں' "نفس بشری" کی گہرائیاں دیکھتی ہیں' میرا ذہن "ضمیر انسانی" کی بلندیوں کے پار پرواز کرتا ہے' میں پہلی نظم "تاج محل" پر کہوں گا' تاج محل جو رعنائی خیال کی معراج' حقیقت ازل کی بزم طور' اور سوز تمام کی تخلیق سرمدی ہے۔"

ریل آگرے پہنچ رہی تھی تو اس کے جسم میں فرط مسرت سے رعشہ تھا' ہوٹل سے جب وہ جمنا کے رخ چلا' اس کے پیر کانپتے تھے' سر میں عجیب قسم کی بھنبھناہٹ تھی' حلق خشک ہو ہو جاتا تھا ———

"کیا میں بیمار ہوں' اس حصے کی آب و ہوا شاید میرے لیے ناموافق ہے' وطن سے نزدیک کسی شئے کو منتخب کر کے نظم کہوں گا' یہاں سے چلا چلوں"

——— مگر دس پندرہ سال سے جس قوت ارادی نے اس کو اپنی دھن میں لگا رکھا تھا وہ کشاں کشاں تاج محل تک لائی' روضے کے کونے کونے میں پھر کر استعجاب و تحیر کے مرحلے اس نے طے کیے' جالیوں سے لگ کر مرقدوں پر رویا' روشوں پر چل کر سرو و صنوبر کی ہوا کھائی' چار دیواری

سے چمٹ چمٹ کر چاندنی میں جمنا کی کہسارزادگی پر اچنبھا کیا، اور سب سے آخر میں میناروں کی سیر کی، چوتھے مینار کی جالی سے لگ کر بیٹھ گیا اور نظم شروع کر دی۔

سویرے مینار کے نیچے ایک شکستہ نعش ملی، ہاتھ میں ٹوٹی پنسل تھی، اور پرزہ کاغذ۔

"میں نے شاعر اعظم بننے کے سارے مادی وسائل قابو میں کر لئے مگر یہ بھول رہا کہ روحانی وسیلے بھی کوئی چیز ہیں، لطافت، شعر کی روح ہے، شاعری کا جوہر ہے، نگاہِ پاک، خیالِ بلند، قلبِ لطیف کے بغیر شاعری کرنا ممکن نہیں، عجم کا حسنِ طبیعت، عرب کا سوزِ دروں، یہ نہ عروضی رسالے پڑھنے سے ملتے ہیں، نہ کلیات اساتذہ چاٹنے سے، ان کی دستیابی کا راز صرف ذوق عمل کی لطافت اور پاکیزگی میں مضمر ہے، میں نے سبھی کچھ حاصل کیا، ان چند سال میں مگر پاکیزگیٔ عمل سے بے بہرہ رہا، اب شعر کہنے بیٹھا ہوں تو گھنٹو سے اپنی بے مائیگی کی تصویر سامنے ہے، جینا بیکار ہے۔"

۵۔ عشق از ین بسیار کردست وکند

رات اندھیری اور طوفانی تھی، ہوا کے تیز جھونکوں سے بند دروازے اور کھڑکیاں لرز رہی تھیں اور "قصرِ کہن" کے پھاٹک کے متصلہ درخت کی پیلی پیلی پتیاں روئی کے گالوں کے مانند اُڑی جاتی تھیں۔

ایک چھوٹی سی کوٹھری کے سوا قصر کے اندر سب جگہ اندھیرا تھا، سب لوگ سو چکے تھے، اس کوٹھری میں تیل کا ایک چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ جس کے زرد شعلے پر، ہوا کے ہر جھونکے سے، جو کھڑکیوں کی درازوں سے اندر آتا، نزع کا عالم طاری ہو جاتا تھا، اس کی محدود و کمزور روشنی سے امکانی فائدہ اٹھانے کی نیت سے چراغ کے بالکل پاس ایک تنومند مرد جھکا ہوا کھڑا تھا، جھکا ہوا، تاکہ چراغ کی روشنی اُس شئے پر جو اس کے ہاتھ میں تھی پوری طرح پڑ سکے، ایک لمبا، پتلا سیاہ چمڑے کا کیس تھا، پرانا اور قدرے شکستہ، ایک قسم کی کسوت، میان یا نیام جس میں سے اُس مرد نے بڑی احتیاط سے ایک ہتھیار نکالا، اس کے پتلے، لمبے، چمکدار، پھلکے میں روشنی نے نگینے سے جڑ دیئے، مرد نے آہستہ آہستہ اُس کی دھار کو چھوا، جیسے اپنے چھوٹے بچے کے سر پر کوئی نرمی سے ہاتھ پھیرتا ہے، اس نے اس کے

خمدار چھلکے پر انگلیاں پھرائیں، اِدھر اُدھر اُلٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر سر ہلایا،

"ابھی حسب دلخواہ تیز نہیں، ارادہ کر لیا ہے تو اب مجھے یہ کام قرینے سے کرنا چاہیئے، سوچنا اور بار بار غور کرنا بھی بیکار ہے، نیت ڈانواں ڈول ہو گی"

اس عورت کا خیال کر کے جس نے اس کو اس درجے کو پہنچایا تھا وہ متبسّم ہوا،

"دیکھیں کیا سوچے گی وہ، جب کل اس کو معلوم ہوگا، یہی کہے گی دل ہی دل میں کہ کاش میں اس سے پہلے کہ وہ ...."

ٹھٹک کر اِدھر اُدھر دیکھ کر اس نے پھر اس شئے پر نظر جما دی، ہلکا سا ارتعاش اُس کے جسم میں پیدا ہوا، جبر کر کے اپنی طبیعت پر اس نے قابو حاصل کیا، اور میز کے خانے سے "سان" نکال کر وہ ہتھیار تیز کرنا شروع کر دیا، جس سے "گناہ عظیم" کا ارتکاب کرنا منظور تھا،

دھار جب اس کی حسب منشا تیزی پر پہنچ گئی تو اس نے کھونٹی پر سے تولیہ اٹھا کر گلے سے لپیٹا، "کپڑوں کو خراب کرنے سے کیا فائدہ ــ کس کو یہ یقین تھا کہ ایک عورت کے لئے ____________

میں یہہ کام بھی کر لوں گا" ____________ چمکتے ہوئے آلے کو میز پر سے لے کر، گردن کس نے اوپر اٹھائی، اور گلے پر اس کو رکھہ دیا،

دم زدن کے لئے اس کو اپنے مرحوم باپ کا خیال آیا جس نے اکثر ایسی حرکت کے خلاف اس کو نصیحتیں کی تھیں، اس عورت کا دھیان آیا جس کی خاطر وہ اتنی بڑی قربانی کر رہا تھا ——— پھر جی کڑا کر کے اس نے اپنی بھری ہوئی شاندار گروا داڑھی کے گچھوں کو جو "سرسید محمد خاں فیشن" سینے تک پھیلے ہوئے تھے، اُسترے سے کاٹنا اور مونڈنا شروع کر دیا ———

"خورشید" کی خاطر جس نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ داڑھی والے مردوں سے کبھی بیاہ نہ کرے گی، فیض الدین بے چارے نے پینتیس سال کی دولت کو قربان کر کے داڑھی اور تجرد، دونوں کو ایک ساتھ خیرباد کہہ دیا۔

کہیں نہ جہاں میں جو اماں ملی تو کہاں ملی

تلاش شروع ہو چکی تھی، بھاگنے والا "جب چڑیاں چگ گئیں کھیت" پچھتا رہا تھا، "نہ بھاگتا تو اچھا تھا"______ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت، جو ہونا تھا ہو چکا، اب تو اتنی جرأت ہونی چاہیے کہ جس کام کا ارادہ کیا ہے اس کو تکمیل تک پہنچایا جائے............ مگر پہلے پیچھا کرنے والوں سے چھٹکارا پانا چاہیے"______ کسی طرف دیکھے بھالے بغیر، ایک صبا رفتار موٹر سے بال بال بچتے ہوئے، اُس نے تیزی سے بھری سڑک پار کی، سڑک کے دوسری جانب پہنچکر، موٹر والے کی کھری کھری کا ذرا لحاظ کیے بغیر وہ ایک گلی میں ہو لیا، اور اس گلی میں بھی ایک بار الٹی طرف دوسری مرتبہ سیدھی طرف، جلد جلد مڑا، کم از کم میل بھر جب نقطہ آغاز سے نکل آیا تو اس نے پیچھے دیکھ کر دم لیا، لال صافے یا خاکی وردی کا کہیں دور تک پتہ نہ تھا، ______

راستے پر چلنے والے کم تھے اور بظاہر کسی کو اتنی فرصت نہ تھی کہ بھگوڑے پر ایک نگاہ غلط انداز سے زیادہ صرف کرے، اب اس کو بھوک ستانا شروع کیا، اودھر اُدھر نظر دوڑائی، وہ کچھ نہیں جی کڑا کرکے

وہ وہاں سے ایک اور بھری سڑک پر آیا، شاید یہاں کھانے کا کوئی شبہ نیا ہو سکے۔" یہاں بھی میدان صاف تھا، اداس، اداس، منہ لٹکائے وہ آگے بڑھا، سائیکل کی گھنٹی بجنے کی پیہم آواز پر اس نے نظر اٹھائی تو ہوٹل والے کا چھوکرا تقریباً سر پر تھا، جست لگا کر وہ ایک جانب ہوا، اور اور سائیکل ڈگمگاتی ہوئی آگے بڑھ ہی رہی تھی کہ اس نے جھپٹا مار کر پیچھے کے کیریر پر سے ٹوکری لی، اور چمپت ——

"لیجو، لیجو" شور مچا، اور پھر پیچھا شروع ہو گیا، سائیکل والا، اس کے پیچھے بغیر جانے بوجھے، پوچھے پاچھے، راستہ چلنے والے، اور ان کے پیچھے مقامی لوگ، بھگوڑا جو، اب، اچکا بھی بن چکا تھا بھاگتا رہا، بار بار، پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا جاتا تھا کہ ایک بار سامنے سے کسی نے کولیا بھر لی، پلٹ کر دیکھا تو پولیس کا جوان ——

"کیا معاملہ ہے، کیا بات ہے" سارجنٹ ریلو نے پیچھا کرنے والوں سے پوچھا، اور قیدی پر ایک نظر ڈالی "اوہو" یہ تو اشتہاری معلوم ہوتا ہے، حلیہ ہوبہو وہی ہے، چلو استاد ذرا تھانے پر چلو میرے ساتھ"

گردن ڈالے، قیدی، لرزتا ہوا، چپکے سے سارجنٹ کے ساتھ ہو لیا بھیڑ پیچھے رہ گئی، چار چھ آدمی البتہ ساتھ آئے، تھانے پر سب انسپکٹر نے یہ بین ڈور سی دیکھ کر پوچھا،

"کیا ہے" پھر غور سے قیدی کو دیکھا "ارے یہ تو وہی اشتہاری ہے

ہم کب سے اس کی فکر میں ہیں، بہت ستایا استاد اب ادھر آؤ، دیکھو کون تم کو نکٹ بنانے کے لیے یہاں بیٹھا ہے "

قیدی لرزتا ہوا، سب انسپکٹر کے پیچھے پیچھے، ویٹنگ روم میں داخل ہوا، مرقع حسن و جوانی ——— "مس فاطمہ حسانی" متحیر اور متشوش کرسی پر بیٹھی تھیں ۔

ایک لمحے کے لیے خاموشی رہی، قیدی اور حسن کی آنکھیں ملیں "کیا وہ درگزر کی توقع کرے" ایک خوشی کا نعرہ لگا کر "بابی" فاکس سیٹر پیر اپنی مالکہ کی گود میں تھا ——— دارلامان میں

۵۔ اب عناصر میں اعتدال کہاں

وہ کرسی کے بالکل سرے پر بیٹھا تھا، سکڑا سکڑایا سمٹا سمٹایا، جھکا ہوا، تقریباً بھیگے ہوئے اونی گیند کے مانند، جیسے کوئی خوف کی آہنی گرفت میں ہو، اس کے ہاتھ کانپتے تھے، مٹھیاں اتنی سخت بھنچی ہوئی تھیں کہ انگلیوں کے پور سفید معلوم ہوتے تھے ہونٹ اس کے مرتعش تھے اور چہرا پیلا پڑ گیا تھا ———— اور یہ سب ڈر، دھڑکے، خوف کے ہاتھوں، جس نے اس کی ہمت اس کی قوت ارادی سب کچھ سلب کر لی تھی اور اس کو اس درجے دکھ پہونچایا تھا کہ اب گزر کرنا اس کی برداشت سے باہر تھا،

کوئی سوا یا ڈیڑھ سوئیاں وقفے اس کی نظر پھر کمرے کے بند دروازے کی جانب اٹھی، "دو منٹ بھر کا معاملہ ہے، پھر درد، دکھ، بے چینی، اضطراب سب ختم" اس نے اپنے دل میں سوچا، اور یہ سوچ کر اس کو سکون محسوس ہوا،

اس نے چاروں طرف دیکھا، چھوٹا سا، صاف ستھرا کمرہ، فرنیچر معمولی سا مگر آرام رسان، ایک میز پر کچھ اخبار، ماہنامے، سہ ماہی پڑے

ہوئے، ان کی جانب دیکھ کر وہ مسکرایا —
"امکان بھر کوشش کرتے ہیں یہ لوگ وقت آنے سے پہلے منتظرین
کی توجہ بٹانے کی، .... " پھر ہنسا وہ آہستہ سے تلخی کے
ساتھ " لیکن کیسے احمق ہیں یہ لوگ بھی، کہیں خبروں اور افسانوں کا مطالعہ
انتظار کی اتنی کٹھن گھڑیوں کی اس الجھن کو گھٹا سکتا ہے —"
دفعتاً وہ کھڑا ہوگیا، شدید اور ناقابل برداشت تکلیف سے بیقرار
ہوکر،

"اس ساری اذیت کا سبب وہی انسان کا ازلی رقیب ہے
اُسی کے کارن ضبط و تحمل گئے، اُسی کی بدولت اب اس بے آرامی اور
اذیت نے جینا دوبھر کر رکھا ہے" — "خیر، میں بھی ایسا بدلا لوں،
سچا سے کہ یاد ہی کرے، اس سارے کرب اور تمام بے چینی کا واحد
علاج وہی ہے، فوری، ضرر کش اور بے اذیت"
بغیر کسی آواز کے بند دروازے کے پٹ کھلے، اور دو آدمی اندر آئے،
ایک غریب "انتظار کنندہ" کی جانب بڑھا — "انتظار کنندہ" نے
گھبرا کے ادھر اُدھر دیکھا، کچھ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا، اور پھر کھلے دروازے
میں سے "کرسی" پر نظر پڑتے ہی سکتے میں آگیا، — "خاص کرسی"
خوفناک ترین نشست گاہ، اس نے منہ پھیر لینے کی کوشش کی آنکھیں
بند کرنے کی، مگر "کرسی" کا نظارہ بند آنکھوں کے روبرو بھی قایم رہا،

اندر آنے والے اشخاص نے کچھ کہے بغیر، انتظار کنندہ کو نرمی سے مگر مضبوطی کے ساتھ پکڑ کر آگے بڑھایا، اس کے پیر کانپے، وہ لڑکھڑایا، پھر خود قابو پا کے "کرسی" پر بیٹھ گیا، اور اس کے ہتھے زور سے پکڑ کے پشت سے ٹیکا لگا لیا،

ایک بار اس کے لبوں کو خفیف سی حرکت ہوئی، بولنا چاہتا تھا، مگر نہ بول سکا،

"جی، کون سی واڑھ ہے" دندان ساز سرجن نے نیچی آواز میں سوال کیا "کرسی نشین" نے منہ کھول کر سوجی ہوئی سیاہی گرفتہ، واڑھ کی جانب انگلی اٹھا دی، اور آنکھیں بند کر لیں، کسی نے مضبوطی سے وہی واڑھ پکڑ لی، ایک جھٹکا ہوا، اور پچھلے تین شبانہ روز کی اذیت و بےچینی سب چشم زدن میں رفع ہو گئی،

"کرسی نشین کے دماغ میں ایک عجیب مسرت کا جذبہ پیدا ہوا، اپنے ہی نہیں، انسانیت کے دیرینہ دشمن ــــ بڑھاپے ــــ سے دوبدو جنگ کا اس نے آغاز کر دیا تھا،ــــ

سناٹا جارہا ہے جس کو جنتا یاد ہوتا ہے

فون کرنے والے کی انگلیاں کانپ رہی تھیں جب اس نے آلے کو اٹھا کر نمبر ملانا چاہا' ۸' ...... ۵' ...... ۴' ...... ۳' ...... ۱ تھے پر اس کے نمی آ گئی' کیں ...... کیں ...... کیں ...... "کیا جواب نہیں دے گا کوئی" صرف دس سکنڈ گزرے تھے اس کو فون اٹھا کے' مگر ایسا معلوم ہوتا تھا دس گھنٹے ہو گئے ہیں'

"آل انڈیا ریڈیو کے دفتر سے بات کر رہا ہوں میں ... کون صاحب ہیں آپ"

"احمد ندیم صاحب سے بات کرنا چاہتا ہوں"

"کیا نام بتاؤں میں احمد ندیم صاحب سے"

"صرف یہ کہہ دیجئے' ظفر آپ سے کل رات کے معاملے کی نسبت گفتگو کرنا چاہتا ہے' وہ سمجھ جائیں گے" ....

....

....

انتظار کے یہ لمحے ظفر کے لئے بڑے سخت تھے' دائرکٹری کی ورق

"میں ہار گیا، بدمعاش ہار گیا، ڈنڈ وت ہے تیری بدمعاشی اور خباثت کے آگے، شام تک رقم تجھے مل جائے گی"

"یوں بات کرو دوست یوں ــــ تم میری بات مانو، میں تمھاری بات سنوں، اچھا خدا حافظ شام کو چھ بجے فتحپوری ہوٹل میں، سمجھے"

× × × ×

فتحپوری کا ہوٹل میں شام کو چھ بجے خاصی چہل پہل تھی ــــ ظفر ایک بڑے "پام" کی آڑ میں کونے میں بیٹھا تھا،

چھ کی بات ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ ظفر کے بازو کی کھڑکی کھلی اور ایک دبلا پتلا نوجوان ادھر ادھر دیکھتا ہوا اندر آیا، ظفر پر نظر پڑتے ہی اس کے چہرے پر نفرت اور غصے کی سرخی اور درشتگی کے آثار نمایاں ہوئے ــــ

"آ گئے تم ندیم، مجھے یقین تھا تم آؤ گے، تم نہایت فہمیدہ اور فریس ...."

ــــ الفاظ ظفر کے ہونٹوں پر ناتمام رہ گئے ــ ندیم نے جیب سے طمنچہ نکال کر اس کے جانب تان لیا تھا،

"تو تم مجھ کو رسوائی و ذلت اور مالی تباہی میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر مجبور کر رہے ہو، ظفر ــــ ہے نا بدمعاش، سن لے کان کھول کر، تیرا وقت آ گیا ہے، اب تو کسی اور کی زندگی برباد

نہ کرے گا، خبیث"

پستول کی نال کا رخ ٹھیک ظفر کے دل پر تھا، ندیم کی انگلی لبلبی پر رکھی تھی، اس نے دھیرے دھیرے اس کو دبانا شروع کیا، ہولے ہولے

.................."

....

پڑھنے والے نے موٹی سی گالی بک کر، کتاب سامنے کی دیوار پہ دے ماری،

.... کی ایسی تیسی، کمبخت آخری صفحے کو ہی غائب ہونا تھا"

۵۔ جو بھی گناہگار ہے، اپنا گناہگار ہے"

کانپتا ہوا، لرزتا ہوا "تاثیر" تین بجے رات کو گھر میں گھسا "جیل میں ہوتا میں اس وقت اگر "گشت" سے مڈبھیڑ ہو جاتی ـــــــ کیا حماقت تھی، پی پلا کر آدھی رات کو موٹروں میں باہر نکلنا، علویہ اور فائلس کو ساتھ لے کر پھر ہوٹل میں خوب پینا، اور پھر "محبوب ساگر" کے بند پر موٹریں دوڑانا، اور راشد بھی نمبری بدھو تھا کہ اس وقت ہاں میں ہاں ملائی، ـــــــ "تنزین" ٹھیک کہتی ہے، میرے دوست اور میرے اعمال مجھ کو کسی دن پھانسی کا تختہ دکھلائیں گے ـــــــ شراب دنیا پیتی ہے، مگر پی کر ایسی بہوش نہیں ہو جاتی کہ سوجھ بوجھ جاتی رہے، آخر "پدم سنگھاسن" کے گھر پر چھاپا مارنے کی کیونکر سوجھی ـــــــ اسی کمبخت راشد نے ذکر نکالا تھا، مذاق اور "ایڈونچر" ـــــــ یہ بھی کوئی مذاق تھا کہ دو بجے رات کو بند گھر میں نقب لگا کر جواہرات غائب کئے جائیں، مانا، پدم ہمارا دوست ہے، مگر یہ کس کو معلوم تھا کہ عین وقت پر دونوں مشٹنڈے اظہر، مظہر، آ گئے، راستہ روکیں گے، اس وقت راشد صاحب کی فطری طباعی بھی نے کوئی کام نہ کیا، بھلا "سرخوشی"

حضرات بھی پستول لے کر کہیں جاتے ہیں، اس وقت رات کو نہ سہی مگر کل پرسوں جب بھی لاشیں ملینگی ایک ہنگامہ ہوگا ——— اور بسے بڑا خطرہ یہہ کہ وہاں سے بھاگے تو سرپٹ جیسے بھوت پریت پیچھے ہوں تال ظاہر تھا، بند پر موٹر سے کسی بے چارے غریب کی مشکل آسان ہوگئی رو گئے کا ہوش کس کو تھا، چوراہے کو پار کیا ہی تھا کہ نیچے کے راستے سے گشت وہاں پہنچی، ایک لمحہ بھی ہم دیر سے آتے تو دھر لیے گئے تھے

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت ——— مگر ولے بخیر ”

ہے بھی کہ نہیں، کوئی چیز یا کوئی نشانی تو میری وہاں نہیں رہ گئی، چھڑی، گھڑی، بٹن، ہیٹ، سب ہیں .... رومال ... ہے، ہے، دستانے کہاں ہیں؟ .... ارے دستانے تو ابھی تک ہاتھوں پر چڑھے ہوئے ہیں، چلو اچھا ہوا“ ابہامات انگشت کا ڈر نہیں رہا، راشد لاکھ بیوقوف سہی، لیکن یقین ہے پستول ضرور دونوں اندھے کنوئیں میں ڈال دئے ہوں گے، ہیجا کا سب نشہ ہرن ہوگیا، شکر ہے خدا کا کہ ”تنزین“ آج کل لکھنؤ گئی ہوئی ہے ورنہ غضب ہی ہو جاتا۔“

”تاثیر نے رات بھر آنکھوں میں کاٹی، طلوع آفتاب نے اس کو کمرے میں مقید درندے کی طرح ٹہلتے پایا، تردد اور پریشانی نے تپ کے مریضوں سے بدتر حال کر دیا تھا، پتہ کھڑکھڑاتا تو اس کی

جانے لگ جاتی، دروازے پر کسی نے دستک دی، اس کا سلیپنگ سوٹ
خراب ہونے کو تھا کہ دودھ والے کی آواز "دودھ لے جاؤ" —— سنبھال لیا،
—— پھر اور دشواری، نوکروں کے بدگمان ہو جانے کے ڈر سے نہا دھو کر وہ
نو بجے ناشتے کے لئے نیچے آیا، میز پر اخبار رکھے تھے، جھپٹ کر اوپر کا پرچہ
کھولا ——

"سیٹھ پدم سنگھاسن کے قصر میں ڈاکے کی واردات"
"محافظوں کا ...."

کمرہ ناچتا ہوا معلوم ہوا، دیواریں گھومتی ہوئی، اخبار اس کے ہاتھ سے
نیچے گر پڑا، اور لڑکھڑاتا ہوا وہ لائبریری میں چلا گیا، ——

"میرے باپ کے اللہ، یہ پولیس والے اور اخبار والے بھی برق ہوتے ہیں،
برق، ابھی پوری طرح صبح نہیں ہوئی ہے اور معاملہ اخباروں تک میں آ گیا،
اب خیر نہیں میری، .... ضرور کچھ نہ کچھ چھوٹ گیا ہوگا،
پدم کے مکان پر .... موٹر کے ٹائروں کے نشان ہوں گے، قدموں
کی علامتیں ہوں گی، کف کے بٹنوں کا کوئی حصہ ٹوٹ کر گر گیا ہوگا، اکثر گر جاتے
ہیں، دیکھ لینا چاہئے" .... گھبرا کے وہ "ملبوس کدے" کی طرف
بھاگا، "وہ کف کے بٹن تو ٹھیک ہیں، سگریٹ کا بھی کوئی بٹن غائب نہیں، ....
سگریٹ کیس بھی صحیح سلامت ہیں .... جوتوں میں مٹی ہوگی، .... جوتوں
کی مٹی نکال کر امتحان کرا کے پولیس نے اکثر قاتلوں کا پتہ چلایا ہے ....

..........کیا کروں، جوتے جلا دینا چاہیئے" ــــــ تیزی سے اس نے آتشدان میں لکڑیاں رکھیں، شعلوں کو بھڑکایا اور جوتے جھونک دیئے ــــــ

"وہ بہتر ہے، واسکٹ، رومال، کوٹ، پتلون سب تلف کر دوں، نہ بجیگا بانس نہ بجیگی بانسری، ممکن ہے کسی پر کہیں کوئی دھبہ یا علامت ہو"ــ

دھب دھب، دھب دھب، دھبا دھب دھب، ــــــ

کسی نے نیچے دروازے پر دستک دی، ــــ لپک کر تا تیز کمرے سے باہر آیا، اور جھک کر نیچے دیکھا، دروازے پر پولیس والا خانساماں سے باتیں کر رہا تھا، ــــ ہیبت سے اس کا دم ہی نکل گیا، ــــ "کیا کروں اے خدا کیا کروں، پھانسی سے تو بچ نہیں سکتا، پھر رسوائی سے کیا حاصل، خود ہی قصہ تمام نہ کر لوں، کوئی ایسا ذریعہ ہو اذیت بالکل نہ ہو، دم آسانی سے نکل جائے ــــ

بجلی کا خزانہ، ــــ خدا جانے کیا اثرات ہوتے ہیں، روشندان کی ڈوری سے سے پھندا، ــــ.......... بڑی بھیانک موت ہے، استرے سے شہرگ کھول لوں، ٹھیک ٹھیک، کتابوں میں میں نے دیکھا ہے، نشے کی طرح بے ہوشی طاری ہو جاتی ہے، اور اسی حالت میں بغیر کسی اذیت کے دم نکل جاتا ہے، یہی ترکیب ٹھیک ہے بالکل ٹھیک، شکر ہے میرا استرا سیفٹی نہیں، ورنہ کس قدر دشواری ہوتی، اس وقت" ــــــ بھاگ کر وہ "بلوکس کلر" میں گیا اور دروازہ بند کر لیا ــ

نیچے پولیس والا، خانساماں سے کہہ رہا تھا،

"خانساماں جی، گھر میں کہیں نہ کہیں آگ لگی ہے، کچھ جل رہا ہے، بو نہیں آئی تمھاری ناک میں،................. اِدھر آؤ، اُدھر، وہ دیکھو چمنی میں سے کس قدر دھواں نکل رہا ہے، یہہ شملہ سہی مگر سردی میں یہاں بھی، گھر پھونک کر لوگ نہیں تاپتے"

خانساماں بھاگ کر تاثیر کے کمرے میں آیا، پولس والا پیچھے پیچھے تھا۔

دروازہ کھولا ——— تاثیر کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی،

ڈاکٹر نے نیچے گرا ہوا اخبار اُٹھا کر کھلا ہوا صفحہ دیکھا،

"سیٹھ پدم سنگھاسن کے قصر میں ڈاکے کی واردات"

"محافظوں کا بیان، ڈاکوؤں کے طپنچوں کی گولیاں مصنوعی تھیں"

یاد رکھ اے دل کہ فطرت ہے سراپا انتقام

نعمانی کا رنگ گیہواں اور چھر اکنا بی تھا ـــــــ وہ کھڑکی کے
سامنے کھڑا ہوا، باہر سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا تو اور لمبا معلوم ہو رہا تھا، بالکل
سوکھے ہوئے، جھریوں والے بڑے چھوارے کے مثل ـــــــ
نعمانی کو آج خود بخود بار بار خیال آرہا تھا کہ وہ مرنے والا ہے ـــــــ
"عملاً نہ سہی ارادتاً میں ضرور قاتل ہوں، کیا رات کو میں موتی لال کو مار ڈالنے
کی نیت سے اُس کے گھر نہیں گیا تھا، مانا کہ "موتی لال" بدترین خلایق میں
سے تھا، اور اُس کے مرنے سے ہزاروں دکھیوں کی گلو خلاصی ہو گئی مگر قتل
بہر حال قتل ہے، وہ تو یہ کہو کہ میرے پہنچنے سے پہلے ہی کسی نے اس کا قصہ
پاک کر دیا تھا، ورنہ میں عملاً بھی قاتل ہوتا، پھر بھی ارادتاً قاتل ضرور ہوں"
نعمانی کی عمر قانون شکنی میں گزری تھی، اب تک وہ جیل سے بچا رہا تھا،
اس مرتبہ مگر اس کو یقین تھا کہ قدرت کا انتقام بہت نزدیک ہے ـــ
یہہ خیالات اس کے ذہن میں گزر رہے تھے کہ سڑک پر اُس نے
اپنے سب سے بڑے دشمن، انسپکٹر گیان چند کو دیکھا ـــــــ
اس کی آنکھوں میں عزم واستقلال کی چمک پیدا ہوئی، اس کے خیالات منتشر

تھے، مگر انتشارِ خیال یہ سوچنے میں مانع نہ ہوا کہ وہ بے گناہ ہو کر پھانسی کے تختہ پر جان دینے سے تو خودکشی بہتر ہے، جیل تو میں کبھی نہ جاؤنگا" ——
تیزی سے وہ بغلی کمرے میں داخل ہوا، المار ی کھول کر ایک گلاس میں کچھ شراب الٹی اور جیب سے ایک چھوٹی سی شیشی نکال کر چند قطرے اس میں سے شراب میں ملائے، —— الماری بند کی اور پھر کھڑکی سے لگ کر کھڑا ہو گیا، ——

دراوزہ کھلا، —
"آخر گئے تم نعمانی، گئے" گیان چند نے فخریہ انداز میں کہا، نعمانی ہنسا، تلخی سے،
"خیر" تمھاری مراد تو برآئی"
"میں نے کہہ دیا تھا تم سے، سونار کی تو ایک لوہار کی، ——
بکرے کی ماں کب تک خیر مناتی"۔
"موتی لل سے بدتر اور خبیث انسان میرے علم میں نہیں، اس کو میں قتل کرتا تو فخر کرتا"
"کیا کہا تم نے" گیان چند زور سے ہنسا، لیکن اس کی ہنسی میں مسرت سے زیادہ مصنوعیت تھی، —— تم نے اس کو قتل نہیں کیا ہ اس کے کمرے کے دروازے پر، اس کے دفتر کی میز پر، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ آلۂ قتل، خنجر کے دستے پر تمھاری انگلیوں کے نشان ہیں، تم کو

وہاں جاتے ہوئے دیکھنے کی شہادت، موجود ہے، میں نے خود تم کو دیکھا،

"تم نے دیکھا" نعمانی نے بھویں ملاتے ہوئے کہا "تم کہاں تھے"

"میں .... میں .... تم کو اس سے کیا مطلب،

تم چلو" گیان چند نے سختی سے کہا،

"ہونھ، کیا بات ہے گیان چند کیا بات ہے، تم بہت گھبرائے ہوئے معلوم ہوتے ہو، تمھاری آنکھوں سے وحشت ٹپکتی ہے"

"چلتے ہو یا یوں ہی باتیں بناتے رہو گے .... چلو، اب اس ٹال مٹول سے کام نہ چلے گا، سیدھے سیدھے جرم کا اقبال کر لو، پھانسی سے بچ جاؤ گے صرف کالا پانی ہوگا"

"ہاں" اور چودہ ۱۴ برس کی جہنم" — "ایک گلاس پینے کی تو مجھے اجازت ہے نا" — پیو گے"

"مجھے کوئی عذر نہیں"

نعمانی پھر بغلی کمرے میں گیا، دو گلاسوں میں شراب ڈال کر سوڈا ملایا، ایک لاکے گیان چند کے سامنے رکھ دیا دوسرا اپنے سامنے —— پھر پلٹ کر کانس سے گرینٹ کیس اٹھا کے ایک سگریٹ جلایا، مڑ کے گلاس ہاتھ میں لیا اور ادھر گیان چند نے گلاس خالی کر کے رکھا، ادھر اس نے خالی گلاس فرش پر دے مارا۔

"چلو" گیان چند نے اٹھتے ہوئے کہا،

"مجھ کو تم یہاں سے زندہ نہیں لے جا سکتے" نعمانی نے اطمینان اور فخر سے سر ہلاتے ہوئے کہا،

"میری تو لاش ہی اب اس گھر سے نکلیگی"

"کیا مطلب تمھارا"

"جو گلاس میں نے ابھی پیا ہے اس میں سم قاتل تھا، دس منٹ کے اندر کام تمام کر دیتا ہے" گیان چند کا چہرا زرد ہو گیا، لڑکھڑا کر اس نے کرسی کا سہارا لیا اور بیٹھ گیا،

"چلو" نعمانی نے گیان چند کی نقل کرتے ہوئے کہا، گیان چند نے دیوانوں کی طرح ہنسنا شروع کر دیا،

"کیا پاگل ہو گئے ہو گیان چند، بند کرو یہ قہقہے" نعمانی نے سختی سے کہا،

"میں بھی موتی لال کے پنجے میں گرفتار تھا، تمھارے پہونچنے سے پہلے میں نے اس کا کام تمام کر دیا، سوچا تھا تم پر الزام جھونک کر بچ جاؤں گا۔ ——— تم جب سگریٹ جلانے مڑے میں نے اس خیال سے کہ مجھے زہر نہ دے رہے ہو، گلاس بدل دیئے" ———

——— گیان چند کی گردن ڈھلک گئی،

تیسرا حصہ

(۱) تجھے معلوم کیا زندانیوں پہ کیا گذرتی ہے۔
(۲) کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معما را

ع تجھے معلوم کیا زندانیوں پر کیا گزرتی ہے

"ایس کی صبح کو ہمیں کچھ مقامی کامیابی ہوئی، ہماری پلٹنیں ربع میل کے عرض میں چھ سو گز آگے بڑھ گئیں، اور جتنی زمین ہم نے چھینی، اس پر قبضہ کرکے مورچے مضبوط کرلئے اس وقت تک (۴۸۶) جرمن گرفتار کئے گئے ہیں، جن میں سے تینتیس افسر ہیں"

یہ تھا وہ مختصر سرکاری اعلان جو "خلاصہ معلومات" (جس کو کسی بگڑے دل ستم ظریف نے "مزاحیہ چٹکلوں" سے تعبیر کیا ہے) میں نکلا، اس سے زیادہ اختصار اور بے تکلی کے ساتھ یہی اعلان، اعلامیئے کی صورت میں بعد کو روزانہ اخبارون میں شائع ہوکر انگریزی دنیا کے حلق سے، انڈے، توس، مکھن، نیچے اتارنے میں ممدو معاون ہوگا، __________ کتنا آسان، کیسا سیدھا سادہ معلوم ہوتا ہے، پڑھنے والوں کو، جیسے کسی بچے کے باغ میں سے سیب چرا لینے کی کی خبر ہو، نقشوں کے خبطی، پنسیں لے لے کر غلط سلط نقشے تیار کرتے ہیں، چند مدعیانِ مہارت جنگ، اسی اطلاع پر سے "لمبی چوڑی حجتوں اور بحث مباحثے میں مصروف ہوجاتے ہیں" اور ملک کی اکثریت ناشتے پر بے دلی سے یہ کہہ کر معاملہ ختم کردیتی ہے کہ

"آج پھر حسب معمول اخبار میں کچھ نہیں" ——— "کچھ نہیں" واللہ یہ بھی ایک ہی رہی، حقیقت حال معلوم ہو تو سر پیٹنے لگیں لوگ" ———

یہ کوئی قصہ کہانی نہیں، اس میں کوئی پلاٹ نہیں، یہ محض مختصر سا بے نمک خاکہ ہے اس کا جو ہر روز اس سرزمین پہ ہوتا ہے، جہاں چاروں طرف ہر ہر قدم پر پانوؤں میں لتھڑنے، لپٹنے والی، بدبودار کیچڑ ہے، اور جہاں آدمی چلتا ہے تو جوتوں کے تلے ادھڑ جاتے ہیں اور موٹریں چھت تک دھنس دھنس جاتی ہیں، جہاں چلنے والا تنگ، خطرناک، پھسلن والے اُن راستوں ہی پہ سے چلتا ہے جو عجیب الوضع گڑھوں، غاروں اور بے جان سڑتی ہوئی لاشوں سے پٹے ہوئے ہیں، وہ لاشیں جو بصارت سے محروم ہو کر بھی آسمان کی طرف ٹکٹکی لگائے ہیں۔

——— یہ جواب لاشیں ہیں، یہی دس دن پہلے اسی قبیل کی "مقامی کامیابی"، حاصل کرنے کو جرمنوں سے دُو بدو ہوئی تھیں ———

اور سب کہتے ہیں "اخبار میں حسب معمول کچھ نہیں!" ———

مگر شاید وہ ٹھیک کہتے ہیں، اس کا تو صرف شعور اور احساس پہ مدار ہے، جیسے دنیا میں ہر خوشی و غم کا مدار شعور و احساس پہ ہے، ....

"میں نے کہا، میں آداب بجالاتا ہوں" ———

مشین گن افسر نے ایک لبریز آب قبر نما غار سے نکلتے ہوئے کہا، "اللہ کا اور تمھارا شکر ہے کہ ہم رات کو آرام سے سوئے اور متعلقین بھی بخریت ہیں"———

ہاں مگر تم دیر سے کیوں آئے"

دوشیزہ سحر پر بکھری ہوئی، کھڑکی سرد و نم رِدا کے اندر سے سفر مینا افسر نے متکلم کو اداس نظروں سے دیکھا ــــــ "محض اور صرف اس لئے کہ میرے بالکل نئے جوتوں کے اُپر اور تلے کے مابین، چلتے چلتے پھسا کے کی آواز کے ساتھ والی مفارقت پیدا ہو گئی، چند خستہ حال غریب، اس تلے کی بازیابی کے مشاغل میں اس وقت بھی منہمک ہیں، ــــــ

چلو گے بھی یا نہیں"

"چلیں گے چلیں گے، ضرور چلیں گے ــــــ مگر ایک لمحہ بھر بعد، ایک خوش آیند لمحے کے بعد، اس سے پہلے نہیں، کسی طرح نہیں، پیارے کیونکہ ...." اس نے گردن موڑ کر پکارا ــــــ "جان .... رس بھری والی شراب، ــــــ صرف ایک ایک گھونٹ .... اور" سفر مینا افسر کی طرف پلٹ کر "دن بھر نیہمیروں کی طرح ہم کلیلیں کرتے رہیں گے"

"اچھی ہے" سفر مینا افسر نے خالی گلاس جان کو واپس کرتے ہوئے کہا "مگر ذاتی طور پر، ارغوانی، اس میں ملا کر رات کو سوتے وقت گرم گرم پینا مجھے زیادہ پسند ہے، بشرطیکہ دو چمچیاں سفید شکر کی اس میں شریک کر لی جائیں .... جانِ من، پھر تم پوری کی پوری فوج کی کمان ہاتھ میں لے سکتے ہو ــــــ"

اس کی آواز مدھم ہوکر گم ہوگئی کیونکہ وہ اور مشین گن افسر مل کر تین کیچڑ بھی میل دور، صف اول کے مورچے کے معائنے کے لئے روانہ ہو چکے تھے، ______ کئی دن سے حجام سے محروم "جان" دیر تک ان کی جانب عقیدتمندانہ نظروں سے دیکھتا رہا۔

"صرف جوہری ہی نہیں شراب کے بارے میں شاعر" اُس نے لبریز عقیدت لہجے میں کہا، قطعاً شاعر، لیکن ذاتی طور پر میں خالص رس بھری کی شراب کو پسند کرتا ہوں، خواہ وہ کیسی ہی ہو" ______ وہ اُسی لبریز آب لحد نما غار میں غائب ہوگیا، جس میں سے مشین گن افسر نکلا تھا اور......

مگر اور آگے کچھ لکھنا خلاف مصلحت ہوگا۔

....

اب گیس کے تڑ کے پر سے پردہ اٹھتا ہے، بیشک سین سنیری ابتک اک گونہ "مضحک" ہے، لیکن دو خصوصی اداکار جو آخری سین تک رہیں گے، اس طرح پبلک سے متعارف ہوگئے، جس مورچے کے معائنے کو وہ نکلے ہیں وہاں اس ڈرامے میں خاص حصہ لینے والی پلٹن پڑی ہے اور خصوصی اداکاروں کا فطری حق ہے، کہ وہ سب سے پہلے ناظرین سے متعارف کرائے جائیں۔

ہے نہیں ....

گہر کی چادر خوب موٹی تھی جب دونوں افسر نکلے، جگہ جگہ خوفناک غار تھے، نیم شکستہ تار اور منہدمہ خندقوں کی علامتیں یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ یہاں پچھلے معرکے میں جرمنوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا تھا، چیدہ چیدہ قریئے کھنڈر ان کی طرف کی

کچھ ہماری طرف کی، راستے میں جا بجا مٹی کی غیر منظم ڈھیریاں، یا زیا بی کی مساعی کے استمرار کی غمازی کر رہی تھیں، ـــــــ بائیں جانب کچھ گری ہوئی، کچھ گرتی ہوئی دیواروں کے کھنڈرات اور ٹکڑے ہوئے درختوں کے ٹھنے، کسی زرخیز، زرعی موضع کے سابقہ وجود کا پتہ دیتے تھے، یہاں بڑی باقاعدگی اور باضابطگی سے گھنٹے میں ایک بار جرمن شل آنے کی زوں زوں، ـــــــ پھر پھٹنے کی کیفیت اور اس کے دھوئیں، ملبے اور ٹکڑوں کے ایک کالم کے اٹھنے کا منظر دیکھا جا سکتا تھا، لیکن یہ مقام ویران اور علامات زندگی سے مُعرّا تھا، اس کے باشندے جا چکے تھے ـــــــ خدا جانے کہاں؟ اور فوجی لوگ ـــــــ فوجی لوگ، خندقوں سے متصلہ خالی از علامات حیات مواضعات سے بہت حذر کرتے ہیں،

ایک عجیب الوضع، ٹمٹنگنی سی شے لب افق دکھائی دی، ـــــــ ویران، بےحس و حرکت، ـــــــ راستے کے ایک نشیب میں یہ شے پڑی تھی اور اس کے قرب و جوار کا حصہ نعشوں کے سڑنے گلنے سے متعفن تھا، بظاہر خالی دبابے سے کھیلنا بھی جرمنوں کے لئے نقصان رساں ثابت ہوا تھا،

لنگڑاتا ہوا، سر پہ پٹی، گالوں پر تین روز کی داڑھی، خاکی وردی پر نیم خشک کیچڑ، ایک شخص مقابل سمت سے اُن کی طرف آیا،

"براہِ نوازش مجھ کو ہنگامی دواخانے کا راستہ بتا دیجئے" وہ ان کے مقابل رُکا ہوا تھا، مگر ہل رہا تھا، جیسے شرابی جھومے،

"بالکل سیدھے چلے جاؤ، اُس ٹمنٹ کے پیچھے تم کو ہنگامی دواخانہ ملے گا" مشین گن افسر نے انگلی سے اشارہ کر کے کہا "تقریباً آدھے میل پر"

"آپ میں سے کسی کے پاس پانی ہے پینے کا؟ کل رات پانی ہماری پلٹن تک نہ پہنچ سکا اور پچھلے چوبیس گھنٹوں میں ہم کو صرف ایک ایک چمچہ چائے کے برابر پانی ملا ہے"

موریچوں کے معائنے کو جانے میں، پانی کی بوتلیں بھلا کون ساتھ رکھتا ہے، ایک ٹھنڈی سانس بھر کے زخمی سپاہی، سلام کے بعد، ہنگامی اسپتال کے سمت پر چل دیا، ————

"بے چارا غریب" سفرمینا افسر نے کہا "نیم مُردہ بھی نہیں تقریباً مُردہ" ——

"مُردے سے بدتر" "لیکن ہنگامی دواخانے پہنچکر" "آمتی کے ڈلاسے کی طرح وہ چاق چوبند ہو جائیگا ———— ہاں تو ہم یہاں بائیں جانب مڑتے ہیں نا" دوسرے نے پوچھا،

تُرک کرانموں نے علامتیں دیکھیں تاکہ بھٹک نہ جائیں، ————

موریچوں تک آنا جانا بظاہر سہل معلوم ہوتا ہے، قارئین کو خیال ہوگا کہ لوگ روانہ ہوتے ہیں اور پہنچ جاتے ہیں، قسمت اچھی ہو روانہ ہونے والے کی تو

قارئین کا خیال درست ہے لیکن بعض جزئیات کو وہ نظرانداز کر رہے ہیں، جن کے سبب سے صفِ اوّل کے مورچے تک آمدورفت میں "کھانا کھانے کو ہوٹل جانے" کی بہ نسبت زیادہ دشواری ہوتی ہے،

پہلے تو منظر اُس مسرت آموزی اور تنوّع کا حامل نہیں، جن پر عکاسی کی جان جاتی ہے، نہ شجر و ثمر، نہ ندی نالے، چھوٹی چھوٹی گل پوش جھونپڑیوں اور رنگین پگڈنڈیوں کا بھی فقدان، یہ کہنا مشکل ہی معلوم ہوتا ہے کہ ہارسنگھار کے درخت کے پاس سے بائیں طرف مڑو اور چنبیلی کے تختے تک سیدھے چلے جاؤ، تو صفِ اوّل کا مورچہ تم کو سیدھے ہاتھ پر ملیگا،

ہارسنگار کے درخت کا معادل دن میں تقریباً دو بار فضا میں گونجتا ہے، اور چنبیلی کے تختے یا اس کے مرادف میں اور باقیماندہ حصۂ زمین میں صرف یہ فرق ہے کہ دس دن پہلے پتھروں کا ایک جھتا بڑے اطمینان سے اس میں غائب ہو گیا، اور ایک روز یہہ فرق بھی مٹ گیا، کیونکہ وہ سب پتھر اپنے تمام بنیادی اجزائے عنصری کی شکل میں پھر نمایاں ہو گئے،۔

صفِ اوّل کے مورچے کی خندقیں بھی جہاں ہیں وہاں ان کا کوئی ٹھیک نہیں، بعض بعض وقت ان کا بیشتر حصہ متصلہ موضع کے ساتھ ہوا میں ہوتا ہے اور جب پھر اس کے قدم ٹکتے ہیں تو یہ قرین قیاس ہی نہیں، بہت ممکن ہے کہ ان کا محل وقوع، سامنے کے نم، تاریک اور خوفناک غاروں کے اندر ہو،

دراصل دقت تو یہی ہے کہ تمام سطح زمیں ایک عریض وعمیق غار ہے، غار اور گڑھے، سارے منظر کا جزو اعظم ہیں، بڑے غار، چھوٹے غار، چوڑے گڑھے، پتلے گڑھے، نم دار، بدبودار، خالی، بھرے، ناقابل اقامت ناقابل قیام ـــــــ ہر طرف گڑھے، ہر قسم کے غار، ہارسنگار کا جھنڈ بھی غار، ہے، اور چنبیلی کا تختہ بھی غار، خندقیں بھی غار ہیں، اور غار بھی خندقیں ہیں، غرض زمین اور منظر کیا ہیں ـــــــ

ایک متعدی مرض ـــــــ آمد و شد کا بڑا حصہ مجبوراً اور مصلحتاً شب کو گزرتا ہے، اس پر بھی اگر نقل و حرکت کی دشواریوں کے باور کرنے میں قارئین کو تامل ہو تو وہ صرف خندقوں میں سے نکلنے اور گھسنے کا تصور کریں، اسی کے ساتھ ساتھ یہ تصور کریں کہ شام آٹھ سے مسلسل پانی برس رہا ہے، تارے تک نظر نہیں آتے، جانے والے کو خیال ہے کہ اگر پانچ قدم بائیں طرف بڑھوں تو خندق کے منہ پر پہنچ جاوں گا، ـــــــ

پانچ قدم وہ بائیں طرف بڑھتا ہے، ـــــ غار اور گڑھے ـــــــ

غار سے بچتا ہے تو گڑھے ہیں، گڑھے سے نکلتا ہے تو غار میں، دو چار غاروں اور گڑھوں میں گرنے کے بعد اب جو وہ نکل کر کھڑا ہوتا ہے تو رخ اور سمت کا سارا اندازہ غتر بود، اب وہ صرف اس قدر جانتا ہے کہ اس کے داہنے بائیں، آگے پیچھے، اوپر نیچے، ہر طرف غار اور گڑھے ہیں شش سمت غار اور گڑھوں سے عبارت ہے ـــــــ

ٹک ٹک ٹک ٹک، جرمن مشین گن کی گولیوں کی آواز اس سمت سے آتی ہے جدھر اُس نے اپنی حماقت سے سوچا تھا کہ اس کی فوج کا دفتر ہے، گولیوں کی سرسراہٹ قریب ہوتی ہے، ایک روشنی کی نبڑی، اوپر سے گزرتی ہے اور دیکھنے والا کیا دیکھتا ہے، ــــــ غار اور گڑھے، ــــــ مجبوراً انھیں میں سے کسی میں پناہ لیتا ہے ــــــ پھٹ پھٹ پھٹ پھٹ، اس کے سر پر سے گولیاں گزرتی ہیں، اور سرسراہٹ کی آواز آگے بڑھ جاتی ہے، دو چار منٹ میں پھر قریب آجائیں گی، اور پھر سر پر سے گزرے گی، لیکن اس اثنا میں کیا کیا جائے ــــــ ہر طرف تو گڑھے اور غار ہیں، اپنی خندق اور مورچہ، سو وہ اتنے ہی دور اور ایسے ہی مبہم جیسے چاند، ــ

ایک اور ضمنی پہلو اس صورت حال کا ہے، جس پر ممکن ہے ایلوں کی نظر، نہ پڑے، یہ بہت معروف حقیقت ہے، اور فرانس میں جنگ کا تجربہ رکھنے لوں سے اس کی تصدیق ہو سکتی ہے کہ زمین کا جو حصہ غار یا گڑھے کی صورت میں نہیں ہے اس کا جزو اکبر، روز مرہ کے راشن کی طرح چلنے والے کے ساتھ چلا آتا ہے، مٹی کے اکڑے کے اکڑے اس طرح ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتے ہیں، اور پھر واپس آجاتے ہیں صرف جوتوں کے ذریعے ہی نہیں، ہاتھ، منہ، رومال، اور دانت سب کے توسط سے، ــــــ ایک روایت ہے، ــــــ گویا کی صحت کا

کا نمودار نہیں ——— کہ ایک بار ایک پلٹن نے ایک حملہ آور جرمن رسالے کو محض ان کی جانب پاؤں جھٹک کر پسپا کر دیا، اس طرح مٹی اور کیچڑ کی جو عظیم مقدار دشمن کی جانب بڑھی اس نے ہرا کر دشمن کے سپاہیوں کو دفنا بھی دیا، بہر حال یہ روایت تو ضمناً بیان کی گئی، ہمیں تو مشین گن افسر اور سفر مینا افسر سے واسطہ ہے، جو ایک کھرا لود، نم، اکتوبری تڑکے ایک جھاڑ شکستہ ربایے گئے پاس کھڑے صف اول کے مورچے کے رخ کے بارے میں سوچ بچار کر رہے ہیں،

"یہ نہیں یہ حیرت کا مقام، ایک آواز عقب سے آئی، "دو کہ انسان فطرتاً حماقت کے اس معیار تک گر گیا ہے" جہاں گا جو کے اس بے ضرر کھیت پر یہ ستم ڈھائے جاتے ہیں" ———

برگیڈ میجر اور اس کے پیچھے برگیڈیر معہ دو افسروں کے نمودار ہوئے۔ ان کے پیچھے سگنل افسر نے اپنے منہ اور ماتھے پر سے فرانس کو پونچھ کر پھینکا، اور پھر دفعتاً پانچوں غائب غلہ ——— ایک سیلابی شور بڑی شدت سے تیز ہو کر آواز کے اس نقطۂ عروج کو پہنچا جو ناپسندیدہ قرب کا غماز ہے۔ سیاہ دھوئیں اور سیاہ تر طیران کیچڑ کا ایک ستون بیس تا پچیس گز بلند ہو کر بتدریج بیٹھ گیا، میناؤں کی ایک ٹکڑی پانچسو قدم پر بکھر سے اڑی اور غائب ہو گئی، پانچوں آدمی جس پر محل تیزی سے غائب ہوئے تھے اسی پر محل تیزی سے پھر نمودار ہو گئے۔ غاروں اور گڑھوں کا بہرحال

کوئی مصرف اور فائدہ ضرور ہے'

" یہ حصہ سڑک کا ہمیشہ سے دشمن کا پسندیدہ ہے" سگنل افسر نے جنرل کو سہارا دے کر غار سے نکالتے ہوئے کہا " یہاں ٹھہرنا خلاف مصلحت ہے جناب والا"

" دو فرلانگ پر یہاں سے ایک خندق ہے، وہاں کمانڈر کا دفتر ہے" ——— پانچوں افسر پیچھے پیچھے کرتے آگے بڑھ گئے اور ایک بار پھر سڑک کے اس نشیبی حصے میں خاموشی اور سکون کا راج تھا.......

اور اب ہم ڈرامے کے خصوصی اداکاروں تک پہنچ چکے ہیں، ایک خندق کی کہرآلود نمی میں جنوبی لومشائر پلٹن کے سپاہی چھپے دبے بیٹھے ہیں، گوشت بھننے کی معدہ گداز مشام سے خندق مہک رہی ہے' بعض کچھ لکھتے ہیں، بعض بڑے کوٹوں میں لپٹے لپٹائے اوپر سے برساتی پڑی ہوئی ابھی تک محو خواب ہیں، لیکن دراصل پوری رجمنٹ بیدار ہو رہی ہے ——— کیونکہ جو صبح مقرر تھی وہ طلوع ہو چکی ہے' اکثر کے لئے نیا معاملہ ہے' بہت سوں کو عادت ہو چکی ہے ———

دو بدو جنگ کی، لیکن کھلاڑی یا اناڑی کوئی نہیں، جس کو اس کا اندازہ نہو کہ شام ہوتے ہوتے پلٹن کے رجسٹر حاضری میں بہت سی غیر حاضریاں ہوں گی، اور کوئی نہیں جس کو اس کا اندیشہ نہو کہ ان غیر حاضریوں میں بہت ممکن ہے اس کا نام بھی ہو ——— سارا کھیل دراصل بقدر

کا ہے، ممکن ہے، اکھڑ و نچہ تک نہ آئے، ممکن ہے سارے جھگڑوں سے چھٹکارا مل جائے، ممکن ہے........

بلا شبہ متخیلہ کا مدار بڑی حد تک شعور کی بیداری پر ہے، ان اسلیوں میں سے نوے فیصدی کو نہ کوئی ہراسانی ہے نہ اضطراب، دس فیصدی کو ممکن ہے، ہراس نہو، مگر اضطراب ہونے میں شبہ نہیں، جو ہونا ہے وہ ہوگا، یہ تو جیسے امن کے زمانے کے لئے سچ اور بجا ہے ویسے ہی جنگ کے اندر بھی، قسمت پر شاکر رہنا لازمی ہے ——— ناگزیر ہے، ——— لیکن "عہ وہی ہوگا جو مشیت کا تقاضا ہوگا" ——— والا مسلک سہل نہیں ——— آدمی کا ذہن کیوں؟ سے خالی نہیں رہ سکتا اور جب بیداریٔ شعور کم درجے کی ہو تو پھر ذہن میں کیوں؟ کی تخلیق ہونا خطرے سے خالی نہیں، ——— اس کیوں؟ کا تشفی بخش جواب صرف "منزلِ مقصود" کی عظمت و عصمت میں پنہاں ہے، اس ادراک میں کہ "محض انفرادی سعی و عمل" ہی اجتماعی کامیابی کی ضمانت ہے، اس یقین مطلق میں کہ کوئی فرد آزاد مطلق نہیں، دس فیصدی کو ان حقیقتوں کا شعور ہے، ——— لیکن انہیں دس فیصدی کے ذہن میں، کیوں؟ کا ہتھوڑا ابھی زور سے چلتا ہے، ان کی فطری تعمیر و ترتیب کے وہ اجزا جو اُن کے دماغوں میں کیوں؟ کا نقارہ بار بار اور شفاف سروں میں بجاتے ہیں ———

وہی اجزا ——— اسی حالت میں جب وہ اپنے کوٹ میں لپیٹے لپٹائے

برساتی کے اندر پڑے سوتے ہیں، یا چائے اور بھنے گوشت کے لیے دکھاوے کا جھگڑا کرتے ہیں، ——— ٹھیک وہی اجزا ان کی فطرت کے داعیات کے اندر اس کیوں؟ کا جواب دے دیتے ہیں ———

مفکروں اور شاعروں کا شعور ایسے لمحات میں زیادہ بیدار اور روشن ہو جاتا ہے، وہ شعور جو اُن کو خودپرستی اور اپنے وجود کی جنبتوں کے ادراک سے بلند تر کر کے ادبیت کے دوش بدوش کھڑا کر دیتا ہے، وہ بے بسی کا اندازہ کر لیتے ہیں، لیکن اُن کو بذیہیت کا احساس بھی باقی رہتا ہے، اور جوں جوں انجام خواب کا دھندلکا، "منظر نگاہ" کو مبہم کرتا ہے وہ دل ہی دل میں افسردگی آمیز تلخی سے مسکراتے ہیں ——— "کس پر؟ طلسم بے بسی" کی اس ساری شعبدہ بازی کی کامل بے معنائیت، بے مقصدیت پر ——— اور مطلق بدیہیت پر انسانی عمال کی عجب شعبدہ بازی کا رخ تاراجی اور تباہی کی جانب ہو جائے ——— اس کے بعد، اس سارے سوچ بچار کے بعد، وہ اپنی چائے اور گوشت کی طرف دیکھتے ہیں تو دونوں ٹھنڈے، اس وقت وہ زمانے اور مقدر کو کوستے ہیں کہ کہاں لا کے پھنسایا ہے۔

نوے فیصدی کی حد تک ایسا نہیں ہے، نہ وہ سوچتے ہیں نہ فکر کرتے ہیں، جنگ کے دونوں خاص رخ ——— موت کا ڈر اور بے دلی کی الجھن، ان کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتے، کیونکہ حیات اور جنگ کے ان دونوں رخوں کے انفرادی تاثرات کا مدام متخیلہ یہ ہے، موت کا ڈر،

موت کی فکر، موت سے کہیں زیادہ دہشت ناک ہے، اور لیے دلی کی الجھنوں سے صرف حساس طبع ہی دوچار ہوتے ہیں، پس فوج میں تقریباً نوے فیصد کو یہ کیوں؟ زیادہ نہیں ستاتا اور یہ اچھا بھی ہے کیونکہ اس کیوں؟ کا جواب نہ ملنا خدشے سے خالی نہیں، ——— اکثر میں سوچتا ہوں کہ ان دونوں طبقات میں سے کون سا مقصد اصلی (جرمنوں کا استیصال) کے لئے زیادہ کارآمد ہے، ——— وہ مختصر طبقہ جو بام قدس تک بلند ہو کر ایک مرتبہ اڑا اڑا وہم، تحت الثریٰ کی پستیوں میں جا گرتا ہے، یا یہ دوسرا طبقہ، سیدھا سادہ ہے، معتدل مزاج، گتھل گردھن کے پکے افسانوں کا۔

بہرحال آمدم برسر مطلب ——— کمانڈر، بریگیڈئیر اور بریگیڈ میجر میں کانا پھوسی کے بعد طے ہو چکا ہے، ساڑھے گیارہ کا وقت ٹھیک ہوگا، ——— ان تینوں کو یہ بھی معلوم ہے کہ، سرے خندق، اس حملے کی منزل مقصود ہے کہ اس خندق کے شمالی گوشے کو حاصل کر کے اس مورچے کو مضبوط کرنے کا فرض سفر مینا کے ذمے عاید ہوا ہے، سفر مینا افسر نے اپنے ماتحتیں کو سب ہدایتیں پہلے ہی سے دے رکھی ہیں، مشین گن افسر نے تو پچیوں کی افہام تفہیم کے بارے سے سبکدوشی حاصل کر لی ہے ———

غرض سارے انتظامات مکمل ہیں، حملہ کامیاب ہوگا یا ناکام ہوگا ——— تفصیلات اور احکام اصل انتظام کی کامیابی کی غرض سے اہم ہیں، ان کی اضافی اہمیت مگر اسٹیج کا پردا اٹھنے سے زیادہ نہیں ———

اور یہ اظہر من الشمس ہے کہ اگر پردہ اٹھتے وقت اٹک جائے تو کھیل میں کھنڈت پڑ جاتی ہے،

برگیڈیر صاحب ناشتہ کر رہے ہیں، برگیڈیر میجر صاحب داڑھی مونچھ سے نبٹنے میں مصروف ہیں، اسٹاف افسر صاحب، سفر مینا افسر سے کھُردرے لوہے کے ایک بڑے تختے کے مطالبے میں محو ہیں۔

"اس قیام گاہ کی چھت ایک عذاب سے کم نہیں، مستقل عذاب، بارش کا پانی، رات کے کھانے کے وقت، شوربے میں برابر کا شریک ہوا کرتا ہے، خدارا کچھ اس کا انتظام کرونا"

"کیا کروں جانمن، میں کیا انتظام کروں، چھت پر بیٹھکر اس پانی کو پکڑوں،

سگنل افسر، جرمن شلوں کی فضائی آمد و شد کے مشاہدے کے بعد کسی بھرے سوچ میں پڑ گیا ہے، اور مشین گن افسر غالباً رس بھری شراب کو پھر ایک بار آزمانے میں،

قصہ مختصر یہ کہ مینجر اور اسٹیج مینجر سب آخری ہدایات دے کر اسٹیج سے رخصت ہو چکے ہیں، اور لمحہ بھر کے اندر کھیل شروع ہونے والا ہے، کھیل کی کامیابی کے لئے جو کچھ کوشش ممکن تھی کی جا چکی ہے اب محض اداکاروں پر تماشے کی کامیابی کا مدار ہے،

دور مشرق جانب فضا میں تین برطانوی ہوائی جہاز اور دو جرمن ہوائی

جہازوں سے مصروف پیکار ہیں، حدِ نظر تک مرتعش
غباروں کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے، سب روزمرہ کے معمولی مناظر ——
اور اس اثنا میں اداکار بےچینی سے پردا اٹھنے کے منتظر ہیں۔

"آؤ باہر چلو یار، صرف دس منٹ اب باقی ہیں" اسٹاف افسر نے
سفر مینا افسر سے کہا —— دونوں اوپر آگئے، اور دوربین نکال
غنیم کے کیمپ کا معائنہ شروع کیا —— داہنی جانب کچھ دور پر
ایکسس خندق میں جوان منتظر کھڑے ہیں،

"صرف ایک منٹ ہے اب" سفر مینا افسر نے پلٹ کر اسٹاف افسر
کی طرف دیکھا، اور پھر دوربین کا فوکس ملایا "اے لو چلے وہ"

دفعتاً چہار جانب سے ایک سامعت گداز اور زہرہ شکن شور اٹھا، ان
دونوں افسروں کے عصبی میدان میں ہزاروں شعلوں کی زبانیں پھڑکتی
اور پھدکتی معلوم ہونے لگیں، جیسے زمین کے اندر سے مسلسل برآمد ہو رہی ہوں،
بارود کی بو اور دھوئیں کے بادل ان دونوں کے سروں پر سے اڑاتے ہوئے
گزرے، دور بڑی بڑی توپوں کی مسلسل دھائیں دھائیں سے کانوں کے پردے
پھٹے جاتے تھے، آپرا کے مولف کے مثل میدانی توپوں سے شور وغوغا کا
ایک مستقل سیلاب رواں تھا، کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی،

اس ڈرامے کے شروع ہونے کے منٹ بھر کے اندر ایکسس خندق سے
انسانوں کی قطاریں اٹھ کر آگے بڑھیں، ان کے ٹھیک سامنے زمین کے اندر

سے دھوئیں کی چادروں پہ چادریں سی نکلتی آتی تھیں، ان میں کبھی وہ چھپ جاتے، کبھی نمودار ہو جاتے، ایک رواں پردے کی آڑ میں یہ لوگ زندہ کلوں کے مثل آگے بڑھ رہے تھے، ان کے دونوں پہلوؤں سے دبابوں کی قطاریں دشمن کو دبا رہی تھیں، اور سروں پہ ہوائی جہازوں نے قیامت اٹھا رکھی تھی،

"کیا کہنے ان بہادروں کی ہمت اور مردانگی کے" اسٹاف افسر نے کہا، لیکن سفر مینا افسر کو کچھ نہ سنائی دیا۔

ہر دوسرے تیسرے لمحے، اس قطار میں سے ایک آدھ ٹھوکر کھا کر گرتا اور ساکت ہو جاتا یا موٹی سی گالی بک کر اپنے ہاتھ پاؤں کے کسی حصے کو پکڑ کر بیٹھ جاتا، انسانوں کی ان قطاروں کے آگے پیچھے، ادھر ادھر اور کبھی کسی قطار کے اندر، شل پھٹتے، کیچڑ، دھوئیں اور انسانی اعضا کا ایک ستون بلند ہوتا، اور جب گرد بیٹھتی تو اس مقام پر یہ قطار کچھ دیر کے لئے شکستہ اور خالی معلوم ہونے لگتی، جلد ہی گر باقی لوگ پھر صفوں کو ٹھیک کر لیتے اور مسلمانوں کی نماز کے مانند شانے سے شانہ ملا کر آگے بڑھتے

______ کچھ دیر میں بم اندازوں کی صف دشمن کے مورچے کے اتنے پاس پہنچ گئی کہ دستی بم پھینکنے لگے، صف میں سے ایک ایک، دو، تیز قدم بھاگ کر جیسے کرکٹ کا بولر گیند پھینکنے کے لئے بڑھے آگے آتے اور بازو گھما کر، بم سامنے غنیم کے مورچے کی جانب پھینک دیتے، کبھی یہ بم

پھٹتے کبھی وغادے جاتے عجب وغا دیتے، پھینکنے والا بالعموم غنیم کے سپاہیوں کی گولیوں کا نشانہ بن جاتا۔ صفوں کے بائیں حصے پر دفعتاً زیادہ لوگ گرنے لگے، جرمن مشین گنوں کی خوفناک ٹک ٹک ٹک ٹک سنائی دی، رفتار اتنی تیز تھی کہ حملہ آوروں کی صفوں کا تقریباً ستھراؤ ہوگیا، یکایک کسی کے ہمت بڑھانے اور دھارس بندھانے کی آواز بلند ہوئی، اور بم اندازوں نے بڑھ کر مشین گنوں کے مقامات والا طبقۂ زمین ہی نیست و نابود کر دیا، صفیں سنبھل کر پھر بڑھیں، مگر ان کے پیچھے شل زدہ اور بم زدہ میدان (جو اب کسی خونخوار جسیم، خوابیدہ، پر شکم، درندے کے پیٹ کی طرح مرتعش، سیاہ اور زرد دھوئیں کے بادلوں سے آلودہ تھا) اس میں اس تمام تحمل بندی کا اولین ثمرا، عیاں تھا ——— شام کی حاضری کے چند غیر حاضرین۔

بغل سے پھر ایک مشین گن نے ان کو بھوننا شروع کیا سامنے جرمن، بہت سے جرمن، درندوں کے مثل ڈکارتے، وحشیوں کے مانند، یا لڑ رہے تھے یا ہاتھ اٹھائے خندقوں کے ایک کونے میں کھڑے تھے۔

ور اس طرح ' لومت شدہ پلٹن ' یا اس پلٹن کے باقیات الصالحات منزل مقصود تک پہنچے ' ملسیل کا پہلا ایکٹ ختم ہوا ' اور بغل سے مشین گن چلانے والا رائفل کے کندوں کی بھینٹ چڑھا دیا گیا ' خندق میں کہیں کہیں کوئی جرمن ' افسردہ ' ملول بیٹھا اپنی مرہم پٹی کر رہا ہے ' کہیں ہمارے دستوں کے زخمی رینگ رینگ کر خندق کے سائے اور حفاظت میں پہنچ رہے ہیں ' عقب میں ' ایکس خندق پر اب فضا زیادہ صاف ہے '

" پیک ' ___ ایک زخمی کمپنی افسر نے بلند آواز سے کہا ' اس کو گمان ہے کہ بچے ہوؤں میں سب سے سینیر افسر وہی ہے ' ایک نوجوان آگے بڑھا '

کمانڈر کو یہ پیام پہنچاؤ ___ " منزل مقصود حاصل کر لی گئی ' داہنی جانب ابھی کچھ جھڑپیں جاری ہیں ' ہمارے تقریباً ہزار آدمی کھیت رہے " ایک پرچہ اس نے پیک کے حوالے کیا '

ڈوکی چلتا ' بھیہ پیک ' خندق سے باہر نکل کر ' جرمن مشینوں اور توپوں کی باڑھوں کے طوفان میں داخل ہو گیا ' دیکھنے والوں نے دیکھا کہ دس قدم چل کر وہ پھسل کر ' سنبھلا پھر پھسلا اور گر پڑا ' اور دو ایک کروٹیں لے کر بے حس و حرکت ہو گیا '

"پیک کام آگیا" ایک سارجنٹ نے پکار کر کہا،

"پیک" پھر کمپنی کمانڈر نے صدا دی، ——— پھر ایک نوجوان آگے بڑھا، کمانڈر سے پیام لیا، اور سابقہ پیک کے مانند دوڑتا باہر چلا گیا، لوگوں نے دیکھا اپنے پیشرو کے پاس پہنچکر وہ جھکا، ٹھہرا، جھک کر اس کو دیکھا، سر ہلایا، پھر سامنے دوڑنے لگا، سو قدم نہیں گیا ہوگا کہ ایک بار گر گیا، جیسے کسی شئے سے ٹکرا گیا ہو، لڑکھڑایا، پھر نسبتاً سست قدموں سے بھاگتا، صحیح سلامت اپنی صفوں میں پہنچ گیا ——— کمانڈر کو پیام پہونچایا اور جواب کے انتظار میں سلام کر کے کھڑا ہو گیا،

تماشہ ختم ہو رہا ہے، کھیل کامیابی سے انجام کو پہونچ چکا ہے، اسٹاف افسر اور سفرمینا افسر مشاہدے کے مقام سے دفتر کو واپس آچکے ہیں۔"

"ہم نے مشرقی جانب سے حملے کا آغاز ہوتے دیکھا، اس کے بعد دھوئیں کی چادروں نے حملہ آوروں کو اپنے آغوش میں لے لیا، اور پھر کیا ہوا ہم نہ دیکھ سکے، قیامت صغرے سے کم نہ تھا وہ منظر

"ابھی دو گھنٹے تک داہنے بازو سے کوئی خبر نہیں مل سکتی" جنرل نے رک رک کر جواب دیا، اپنے پائپ کی اس نے راکھہ جھاڑی ——— اس کے ماتحتیں ہی تھے، جنہوں نے ابھی قیامت صغرے میں حصہ لیا تھا، انھیں کے ساتھ وہ روز کھاتا پیتا سوتا اور جاگتا تھا، وہ صحیح سلامت تھا، اور ان میں سے ہزاروں محض

مٹی تھے، ؏ مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لیئم۔

"چلو اتنے لنچ سے نبٹ لیں"

بتدریج شل باری اور بمباری کم ہوگئی، وقفے وقفے سے ایک آدھ شل سائیں سائیں کرتا اوپر سے گزر جاتا تھا ——
وہی ہوائی جہاز یا اُن کے سے دوسرے ہوائی جہاز اِدھر اُدھر فضا میں پرواز کناں، وہی غباروں کے سلسلے، —— دفعتاً ایک پیک افق پر نمودار ہوا۔ سگنل افسر نے آگے بڑھ کر اس سے پیام حاصل کیا اور پڑھا، ——

"خوب خوب، بڑے میاں کی اب باچھیں کھل جائیں گی"

"یہہ پیام ابھی آیا ہے، ملومشائیر پلٹن کے کمانڈر کے پاس سے" اس نے جنرل کے پاس پہونچکر سلام کر کے کہا "خندقوں پر قبضہ کر کے مورچے مضبوط کر لئے گئے۔ تقریباً پندرہ سو آدمی کام آئے ہیں"

بڑے میاں کی واقعی باچھیں کھل گئیں،

اسطرح اکیس کی صبح کو ہم کو تھوڑی سی کامیابی ہوئی، اور ایک ربع میل کے عرض میں ہم نے چھہ سو گز تک اپنی صفوں کو آگے بڑھا لیا،
گھروں میں آرام سے بیٹھنے والوں کو یہی معلوم ہوا کہ کچھہ نہیں معمولی واقعہ

ہے لیکن ـــــــ پہلا پیک عروس اجل سے ہمکنار ہوا، اور ان پندرہ سو میں سے کم از کم ہزار ایسی نیند سوئے ہیں کہ پھر نہ چونکیں گے، کیوں ؟ کا ان کو جواب شافی مل چکا ہے، اور خبریں پڑھنے والے کہتے ہیں کہ اخبار میں حسب معمول کچھ نہیں ـــــــ کیا واقعی یہ سب کچھ نہیں ہے۔

؎ کہ کس نکشود و نکشاید بہ حکمت ایں معمّا را

بہت پرانے زمانے میں ایک بادشاہ تھا، نیم وحشی، نیم متمدن، ـــــ لاطینی پڑوسیوں کی ترقی پذیری کے طفیل گو اس کے خیالات اک گونہ معتدل اور روشن ہو چکے تھے، پھر بھی اس کی رہی سہی بربریت کے لحاظ سے ان میں غیر معقولیت، بے آئینی، اور بگڑے پن پایا جاتا تھا، نوجی آدمی تھا، اور ایسے دبدبے و رعب کا کہ جنبش ابرو پر فرمان کی تعمیل ہوتی تھی، سوچ بچار کرنے کی خو تھی، اور جب غور و فکر کے بعد وہ کسی رائے پر پہنچ جاتا تو یہ سمجھو کہ وہ کام گویا ہو گیا ـــــــ اس کی حکومت کے سب کل پرزے جب ٹھیک چلتے، وہ خلیق، بشاش اور مہربان رہتا، جب کوئی پرزا بگڑ جاتا وہ بہ ظاہر زیادہ بشاش اور زیادہ مہربان معلوم ہوتا، ٹیڑھے کو سیدھا کرنے اور بگڑی ہوئی کلوں کو ٹھیک کرنے سے زیادہ مزا اس کو کسی بات میں نہیں آتا تھا،

پڑوسی ملکوں سے جو خیالات اور روشیں مستعار لے کر اس نے اپنی مملکت کو متمدن بنایا تھا، ان میں "کھلے دنگل" کی رسم بھی تھی، جہاں اس کی رائے میں مردانہ مگر درندہ نما بہادری کی نمایش کے ذریعے رعایا کی ذہنی تربیت

ہوتی تھی ——— یہاں بھی لیکن اس کے برعکس تصورات دب نہ سکے، اور شاہی دنگل کی تعمیر کا مقصد پہلوانوں کے رجز سنانے یا مذہبی مجنونوں اور حبشی درندوں کی کشتیاں دکھانے کا موقعہ دینے سے کہیں زیادہ عامۃ الناس کے قوائے فکر و عمل کی خفیہ صلاحیتوں کو بیدار اور بیدار صلاحیتوں کی تزئین و تربیت کرنا تھا، دنگل کے وسیع ایوان کی گیلریاں، غلام گردشیں حجرے اور نیم روشن برآمدے، "عدل گستری" کا معدن تھے، جہاں مطلق خیر جانبدار اور کامل غیر جانبداری "حسن اتفاق یا سوء اتفاق" کے ہاتھوں بدی کی سزا اور نیکی کی جزا ملتی تھی ———

جب کسی پر کوئی سنگین الزام لگایا جاتا، ملک میں منادی کرادی جاتی کہ فلاں تاریخ فلاں روز فلاں وقت پر "شاہی دنگل" میں ملزم کی قسمت کا فیصلہ ہوگا ——— ایوان بھرنے اور بادشاہ کے درباریوں سمیت شاہی چبوترے پر متمکن ہوجانے کے بعد بادشاہ کے اشارے پر نیچے دنگل میں ایک دروازہ کھلتا، اور ملزم دنگل کے اندر داخل ہوتا، اس کے بالکل سامنے دو بالکل ایک ہی سے بند دروازے ہیں، ہو بہو یکساں، وہی وضع قطع، وہی سائز، اور وہی پردے، ملزم پر یہ لازم تھا کہ دنگل کے اندر آکر ان دونوں دروازوں میں سے کسی ایک کو کھول دے، دروازوں کے انتخاب میں اس پر کوئی پابندی نہیں تھی نہ اس کو اس باب میں کسی طرح متاثر یا مجبور کیا جاتا تھا، مدار بالکلیہ صرف حسن اتفاق یا سوء اتفاق پر

پر تھا، ان کمروں میں سے ایک میں بھوکا شیر ہوتا تھا، مملکت بھر کا سب سے خونخوار، بیرحم شیر، اگر وہ دروازہ ملزم نے کھول دیا تو فوراً شیر اس کو دبوچ کر تکا بوٹی کر دیتا، اور سمجھا جاتا کہ خطاکار کو قصور کی قرار واقعی سزا ملی ــــــ

اگر ملزم دوسرا دروازہ کھولتا تو اس میں سے ملزم کی عمر، حالت، حیثیت کے مطابق حسین و جمیل، نازک اندام، خوش پوشاک، نازنین برآمد ہوتی، اور اس سے ملزم کا فوراً عقد کر دیا جاتا اور بے گناہی کے صلے میں زر و زیور سے بادشاہ اس کی دستگیری کرتا، پہلے سے ملزم متاہل ہے اور عیال دار، یا غیر متاہل ہے تو کہیں اور منسوب ہے، ان امور کا سزا اور جزا کی اس مہتم بالشان اسکیم کے نفاذ میں کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا،

یہ تھا اس بربری بادشاہ کا طریقۂ عدل گستری، اس طریقہ کی دیانت مسلّم ہے، ملزم کو اس کا کوئی اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ کس دروازے سے نازنین برآمد ہوگی، اور کس سے شیر، کوئی سا ایک دروازہ کھولنے کی اس کو پوری آزادی فکر و عمل حاصل ہوتی تھی، دروازہ کھولتے وقت بھی اس کو اس کی ذرا خبر نہ ہوتی تھی کہ چشم زدن میں وہ موت کے زبردست چنگل میں ہوگا، یا پیکر جمال کے نرم و نازک آغوش میں، کبھی شیر بائیں طرف کے حجرے میں سے نکلتا کبھی داہنی جانب کے کمرے میں سے برآمد ہوتا، یہی صورت نازنین کی برآمدگی کے باب میں تھی ــــــ

اس عنوانِ معدلت میں نہ صرف بد دیانتی کا کوئی شبہ تک نہ تھا، بلکہ سزا

یا جزا کی تجویز کا بھی فوراً عملاً نفاذ ہوجاتا تھا، یا ملزم جہنم واصل ہوجاتا یا جنت ارضی کی حور، اس کو مل جاتی، بہرطور شاہی ذلگل کے عنوان عدل گستری سے مفر کسی کو نہ تھا ـــــ یہہ طریقہ مقبول عوام بھی بہت تھا، جس وقت لوگ ڈھنڈورے کے مطابق ایوان میں جمع ہوتے تو اس سے بالکل خالی الذہن کہ آج کے تماشے کا انجام خون آلود کفن پر ہوگا یا زرتار لباس عروسی پر، شبہے اور دبدھا کے اس لگاؤ نے اس قسم کی تقاریب سے عامۃ الناس کو غیر معمولی شغف و التفات پیدا کر دیا تھا، جمہور اس عمل سے مطمئن بھی تھے اور ملتفت بھی، کیونکہ اپنے مقدر کا بنانا یا بگاڑنا بالکلیہ ملزم کے ہات میں تھا، اور کلیۃً اس کی گنہہ گاری یا بے گناہی پر منحصر ـــــ

نیم متمدن یا نیم وحشی بادشاہ کی ایک ہی لڑکی تھی، پھول کی طرح شاداب و رنگین، محبت کے مانند جوان اور جمیل ـــــ لیکن باپ سے بڑھ کر شاہانہ مزاج، دھن کی پکی، جذبات کی بندی، باپ کی آنکھوں کی روشنی اور ٹھنڈک، اور موجودات میں باپ کو سب سے زیادہ عزیز، باپ کے درباریوں میں ایک عالی خاندان، مگر مفلوک الحال نوجوان بھی تھا، وجیہہ و شکیل، خوش صفات، خوش اوقات دونوں ایک دوسرے پر ریجھ گئے، شہزادی کو اپنے محبوب میں کوئی خامی نظر نہیں آتی تھی، خوبصورت وہ تھا سو تھا ہی ہیں، سلطنت کے طول و عرض میں اس کی نظیر نہ تھی، اعلیٰ نسبی و نیک چلنی میں اس کی کسی کو شبہ نہ تھا، اس لیے شہزادی دل و جان

سے اس کی والہ و شیدا تھی، اور باپ کا پرورش کا جس قدر حصہ اس کو ملتا تھا، اس نے اس فریفتگی میں حسن کی گرمی، اور عشق کی پختگی مل کر رکھی تھی، ـــــ محبت کے کاروبار کچھ دنوں بے خلل و غش چلتے رہے، مگر ایک دن بادشاہ کو خبر ہو ہی گئی، اس کا عدل، امیر و غریب، اپنے اور غیر، سب کے لئے یکساں تھا، فوراً عاشق کو قید کر کے اعلان کرا دیا کہ فلاں روز، فلاں وقت، شاہی جنگل میں اس کے مقدمے کی حسب معمول تحقیقات ہو گی ـــ

یہ مقدمہ ہر لحاظ سے انوکھا تھا اس لئے عوام کو اس سے بہت دلچسپی پیدا ہوئی، اس سے پہلے کبھی کسی عامی نے بادشاہ کی نورِ نظر سے محبت کرنے کی جراءت نہیں کی تھی، اور گو بعد کو یہ بات عام ہوئی، پھر بھی اس وقت تو غیر معمولی ہی سمجھی جاتی تھی ـــ

سارے ملک کے جنگل سب سے خونخوار اور بے رحم شیر کے لئے چھان ڈالے گئے اور سلطنت کی جملہ کنواریوں پر اس جراءت بیجا رکھنے والے امیر زادے کی دلہن کے انتخاب میں نظر ڈالی گئی کہ اگر قسمت اس کا ساتھ دے تو پہلو نشینی کرنے والی، صورت، عمر، اور رتبے کے لحاظ سے اس کے حسب حیثیت ملے، ـــــ سب کو معلوم تھا کہ الزام سچا ہے، گنہگار نے شہزادی سے محبت کی ہے، اور ضرور کی ہے، مگر بادشاہ کو ان جزئیات سے بحث نہ تھی، اس کو اپنے طریقۂ معدلت سے کام اور اسی پر اطمینان اور بھروسہ تھا،

علاوہ ازین انجام کچھ ہو، بادشاہ کا مطلب پورا ہو جاتا تھا کہ شہزادی، نوجوان امیر کے دام محبت سے نکل جائے،

آخر مقررہ دن آپہنچا، دور و نزدیک سے اَن گنت آدمی ایوان مین جمع ہوئے ــــــ گیلریاں، غلام گردشیں، چھجے، سب لبالب ہو گئے، پھر بھی بہت سوں کو جگہ نہ ملی تو یہ محروم چار دیواری کے اوپر چڑھ کر بیٹھے، بادشاہ اور اس کے درباری، موت و حیات بخشنے والے دونوں دروازوں کے مقابل شاہی چبوترے پر جلوہ افروز ہوئے، وہ دروازے جو بہ ظاہر یکساں اور بباطن اس قدر جداگانہ تھے، یہہ سب کچھ ہو جانے کے بعد بادشاہ نے اشارا کیا، شاہی چبوترے کے نیچے دروازہ کھلا اور شہزادی کا محبوب صحن دنگل میں داخل ہوا ــــــ کشیدہ قامت، شکیل، جوان رعنا، اس کے سامنے آتے ہی تماشبیوں میں تردد کی لہر دوڑ گئی، کسی کو یہ خیال نہ تھا کہ ایسے چاند کے ٹکڑے کو خاک میں ملانے کا سامان کیا گیا ہے، شہزادی کی بھول پر جن جن کو اب تک اچنبھا تھا وہ بھی جاتا رہا،

جوان رعنا نے صحن میں آکر، مطابق رواج بادشاہ کی طرف خمیدہ ہو کر شاہی سلام کی رسم ادا کی لیکن اس کے دیدہ و دل کی نگاہیں کسی اور ہی طرف تھیں، اوس کی آنکھیں شہزادی پر جمی تھیں، جو بادشاہ کی پہلو مین بیٹھی تھی ــــــ نیم بربری باپ کی بیٹی نہ ہوتی تو شاید گشتنی عاشق کی یہ محبوبہ اس منظر کو دیکھنے اور اس میں شریک ہونے ہی

نہ آتی ، مگر اس کی شعلہ مزاج طبیعت اس کا جذبات وحیات سے مشتعل اور مملو ضمیر، یہ نہ مانے، منادی ہونے کی گھڑی سے اس بے چاری کو اس معاملے اور اس کی اونچ نیچ کے سوا کوئی سوچ ہی نہ تھا، کم ہمت ہوتی تو رو دھو کر بیٹھ جاتی، مگر اپنی مستقل مزاجی اپنے اقتدار اور تڑپ کی بدولت اس نے وہ کام کیا جو اب تک کسی سے نہ ہوا تھا، یعنی موت وحیات کے ان دونوں بند دروازوں کے اندر کا حال معلوم کر لیا، اتنے بڑے مجمع میں سے ایک صرف اُس کو خبر تھی کہ کس حجرے میں شیر منہ کھولے بیٹھا ہے، اور کس میں نازنین کا آرزو بھرا دل دھڑک رہا ہے، ان دونوں مسدود اور مضبوط دروازوں کے اندرونی حصے پر دبیز اچرمی پردے پڑے تھے، اور یہ امکان بھی نہیں، ناممکن تھا کہ دروازے کو ہاتھ لگانے والا اندر کی کسی آہٹ یا آواز سے کوئی پتہ چلا سکے، مگر شہزادی کے عزم اور اس کے روپیہ نے یہاں بھی قاضی الحاجاتی کی تھی،

شہزادی کو لیکن یہ بھی اطلاع تھی کہ نازنین والے حجرے میں کون سی نازنین، اشتیاق وآرزو کی شعلہ سامانیوں اور ملبوس عروسی کی نکہت بیزیوں کے ساتھ منتظر پذیرائی ہے، دربار کی سب سے زہرہ جمال نازنین کو اس جوان رعنا کے صلۂ بے گناہی کے لئے چنا گیا تھا، اور شہزادی کو فطرتاً اس نازنین سے رقابت کے سبب سخت نفرت تھی، شہزادی نے اکثر اس نازنین کو اپنے چہیتے کی طرف مشتاق اور دزدیدہ نگاہوں سے نگران

دیکھا تھا، اور اس کو گمان تھا کہ اس کے چہیتے کے دل میں بھی اس نازنین کی چاہت کی چنگاری سلگتی ہے، کبھی کبھی اس نے دونوں کو محو گفتگو بھی پایا تھا، گھڑی دو گھڑی کے لئے ہی سہی مگر گھڑی دو گھڑی میں کیا کچھ نہیں کہا جا سکتا، ممکن ہے یہ گفتگوئیں بالکل بے ضرر اور غیر متعلق ہوں، مگر شہزادی کو تو اس کے خلاف خیال تھا، یہ نازنین حسین اور جمیل تھی مگر اس نے شہزادی کے چہیتے سے دل لگانے کی جراءت کی تھی، اس لئے شہزادی کو اس سے بہت عناد تھا، اور نیم بربری باپ کی سچی اور چہیتی بیٹی ہونے کے سبب اُس کے اس عناد کے جذبے کی کوئی حد و انتہا نہ تھی،

چہیتے نے شاہی سلام کی رسم ادا کرتے کرتے جب محبوبہ کی طرف دیکھا اور دوری کے باوجود اَن گنت سروں اور چہروں پر سے گزر کر جب دونوں کی آنکھیں ملیں، تو نوجوان نے اس شعور کے طفیل جو ایک جان دو قالب ہستیوں کو قدرت عطا کرتی ہے، فوراً یہہ جان لیا کہ اس کی محبوبہ کو بند کمروں کے اندر کا سب کچا چٹھا معلوم ہے، وہ اپنی چہیتی کی رگ رگ سے واقف تھا اور اس کو خبر تھی کہ اُس کی سی فطرت اُس راز کو جو اوروں سے حتیٰ کہ بادشاہ سے چھپا ہے، جانے بغیر چین نہیں لے سکتی، شہزادی کی فطرت کے اسی انداز سے یہ عاشق نے اپنی امیدوں کی بنیادیں رکھی تھیں، اور محبوبہ سے آنکھ چار ہوتے ہی اس کو محسوس ہو گیا کہ اس کی توقعات رائیگاں نہیں ہوئیں ——— اب اس کی متردد اور تشویش آنکھوں نے

نظروں ہی نظروں میں شہزادی سے آتا پتا پوچھا، شہزادی کو اس کے استفسار کا اس قدر واضح احساس ہوا، جیسے اس کے چہیتے نے پکار کر بہ بانگ دہل اس سے سوال کیا ہو، پلک جھپکانے میں استفسار کیا گیا، اور پلک مارنے ہی میں جواب دینے کی ضرورت تھی، سیدھے ہاتھ میں جو سامنے کٹھگر پر رکھا تھا، چھوٹی سی سنہری پنکھیا تھی، اس کو ذرا سی حرکت دے کر شہزادی نے سیدھے جانب کے دروازے کی طرف اشارا کر دیا، سوائے ملزم کے کسی اور کے فرشتوں کو بھی اس اشارے کی، اس جنبش خفیف کی خبر نہ ہوئی، کیونکہ اس وقت ہر آنکھ ملزم کی طرف تھی، وہ پلٹا اور پُر عزم، تیز قدموں سے دروازوں کی جانب بڑھا، ایوان میں موت کا سناٹا تھا، ہر آنکھ نم تھی، مگر حسین ملزم کی جانب نگران، ہر دل کی دھڑکنیں دھیمی تھیں، اور سانس روکے لوگ انجام تماشہ کے منتظر تھے، ملزم نے بغیر کسی تامل اور جھجک کے سیدھے ہاتھ کا دروازہ کھول دیا،

اس قصے کا راز مگر یہ ہے کہ شہزادی کے بتائے ہوئے دروازے سے، شیر نکلا کہ نازنین؟ —— جتنا جتنا ہم سوچتے ہیں اس کا جواب دینا مشکل تر نظر آتا ہے، دونوں رایوں کے لئے بڑی گنجایش ہے، اور صحیح جواب تک پہنچنے سے پہلے جذبات فطرت بشری اور احساسات قلب انسانی کی پیچ در پیچ بھول بھلیوں کو طے کر لینا ضروری ہے جن سے کم لوگ سلامتی کے ساتھ گزر سکے ہیں، سوچئے اور غور کیجئے۔ اپنے نقطہ نظر

سے نہیں، بلکہ اس نیم متمدن، نیم بربری، گرم مزاج، آتش خو، پیکر جذبات شہزادی کے نقطۂ نظر کے لحاظ سے، جس کی روح یاس و رقابت کے دو آتشہ شعلے بھڑکانے والے کرۂ معاونیں بھسم ہوئی جاتی تھی، اس کا محبوب اس کے ہاتھ سے نکل چکا، مگر وہ کسی دوسرے کا ہو کر کیوں رہے، ــــــ سوتے جاگتے، ہر وقت اس کو یہی غم کھاتا تھا، اسی الجھن میں وہ تڑپتی اور کروٹیں بدلتی تھی، جب اس کو خیال آتا کہ محبوب اس کا دروازہ کھولنے پر بھوکے شیر سے دوچار ہو گا تو وہ خوف اور دہشت کے مارے دیوانی ہو کر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ لیتی، لیکن عالم تخیل ہی نے اس کو اکثر یہ بھی دکھایا تھا کہ دروازہ کھلتے ہی حجرے کے اندر سے شیر کے بدلے نازنین برآمد ہوئی ہے، اس کے عاشق کا چہرا جان بچ جانے پر اور نازنین کے حسن وجمال کے نظارے سے پرخوشی سے دمک اٹھا ہے اور خوشی کی چیخ کے ساتھ دونوں ایک دوسرے کو گلے لگا لیتے ہیں، اب کے وہ غم اور غصے رشک و رقابت سے پیچ و تاب کھا کر پاگل سی ہو جاتی، کپڑے پھاڑتی، اور بال نوچتی ــــــ جب اس کی نگاہ تصور کے روبرو یہ نظارہ آتا کہ قاضی بادشاہ کے حکم سے وہیں دنگل میں آکر اس کے چہیتے کو اور اس کی رقیبہ کو رشتۂ عقد میں منسلک کر رہا ہے، اور جب اس کے کانوں میں حاضرین کے نعرہ ہائے مسرت گونجتے تو وہ بپھری ہوئی مگر مقید شیرنی کے مثل اپنے شبستان عیش کے بام و در سے

سر ٹکراتی اور سوچتی " اس سے تو یہ کہیں بہتر ہے کہ وہ شیر کے منہ کا نوالہ بن کر سارے جھگڑوں سے ایک بار ہی چھوٹ جائے اور اس سیمیا کی سی نمود رکھنے والی دنیا سے نکل کر مذہب کی بتائی ہوئی جنت کے دروازوں پر اس کے انتظار میں اپنا آغوش وا رکھے" ———— پھر اس کو خونخوار شیر کا تصوّر، اور محبوب کی خاک و خون میں لتھڑی ہوئی نعش کا دھیان بندھتا اور وہ لرز کر آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیتی،

وقت آنے پر اُس نے پلک جھپکانے میں اشارا کر دیا، لیکن اشارا کس دروازے کی طرف کیا جائے گا، اس کا فیصلہ رات رات بھر جاگ کر، اور دن دن بھر رو دھو کر اس نے پہلے سے کر رکھا تھا، اس کو یقین تھا کہ محبوب اس کا مشکل میں ضرور اس سے دستگیری کا طالب ہوگا، اور اس نے پہلے سے یہ قطعی طور پر سوچ رکھا تھا کہ کس دروازے کی جانب وہ اس کی رہبری کرے گی، جب ملزم نے اُس سے سب خاموش کے ذریعے التجا کی تو کسی تامل یا پس و پیش کئے بغیر اس نے سیدھے ہاتھ کے دروازے کی طرف اشارا کر دیا ———— اس کے فیصلے کا مسئلہ آسانی سے حل ہونے والا نہیں، اور نہ معمولی علم و شعور کا انسان اس کے حل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے، اس لیے یہ عقدہ اب تک لاینحل ہے

" جب شہزادی کے محبوب نے دروازہ کھولا تو اس میں سے شیر برآمد ہوا کہ "نازنین"؟ (ماخوذ)

ماہنامہ
ہماری کتابیں
رسالہ
یہ اردو میں اپنے طرز کا واحد علمی تحقیقی اور تنقیدی رسالہ ہے جو علی شبر صاحب حاجی
بی ایس سی (عثمانیہ) کے زیر ادارت شائع ہو رہا ہے اس رسالہ میں ہر ماہ
عنوانات ذیل کے تحت بہترین مضامین شائع ہوتے ہیں۔
مقالات
مشاہیر مفکرین اردو اور بلند پایہ محققین ادب کے افکار جمیل اور تحقیق
انیق کے بیش بہا جواہر پارے۔
اچھے مضامین
ہندوستان کے مشہور رسائل کے منتخبہ مضامین کا تعارف
افادیت کے لحاظ سے۔
قابل مطالعہ کتاب ۔ کتاب کا مختصر اور جامع خلاصہ۔
تذکرہ
محسنین اردو اور مشاہیر ادب کے ذاتی حالات زندگی اور علمی و ادبی
خدمات کا تحقیقی و تنقیدی روشنی میں مبسوط جائزہ۔
علمی استفسارات
قارئین کے تحقیق طلب استفسارات کے معلومات افزا اور بصیرت افروز
جوابات نہایت دلکش رنگین اور پسندیدہ طرز بیان میں۔
تبصرہ
فن تنقید کے جدید اصولوں کے ساتھ زبان اردو کی بہترین تصانیف پر
ماہرانہ انتقاد۔
تعارف
جدید ترین مطبوعات اردو کی فن وار تقسیم اور عنوان موضوع کا سرسری خاکہ
علم کتب خانہ
کتب خانوں اور دار المطالعوں سے متعلق ٹھوس اور فنی مضامین۔
ایک سو سے زائد مطبوعات کے نام معہ مصنف، ناشر، قیمت، سنہ اشاعت
اور فن وار تقسیم۔
سررشتہ تعلیمات ممالک محروسہ سرکار عالی اور گورنمنٹ سندھ نے مدارس کیلئے منتخب و منظور فرمایا ہے
مہتمم محمد عبد الہادی (عثمانیہ)
چندہ سالانہ